

دکڑے وگا

سوبا اور مایا دونوں ہمیں اپنی ماں کے ساتھ گھر کی اوپری منزل میں رہائش پذیر ہیں۔ ان کے والد کی وفات ان کے بچپن میں ہی ہو گئی تھی۔

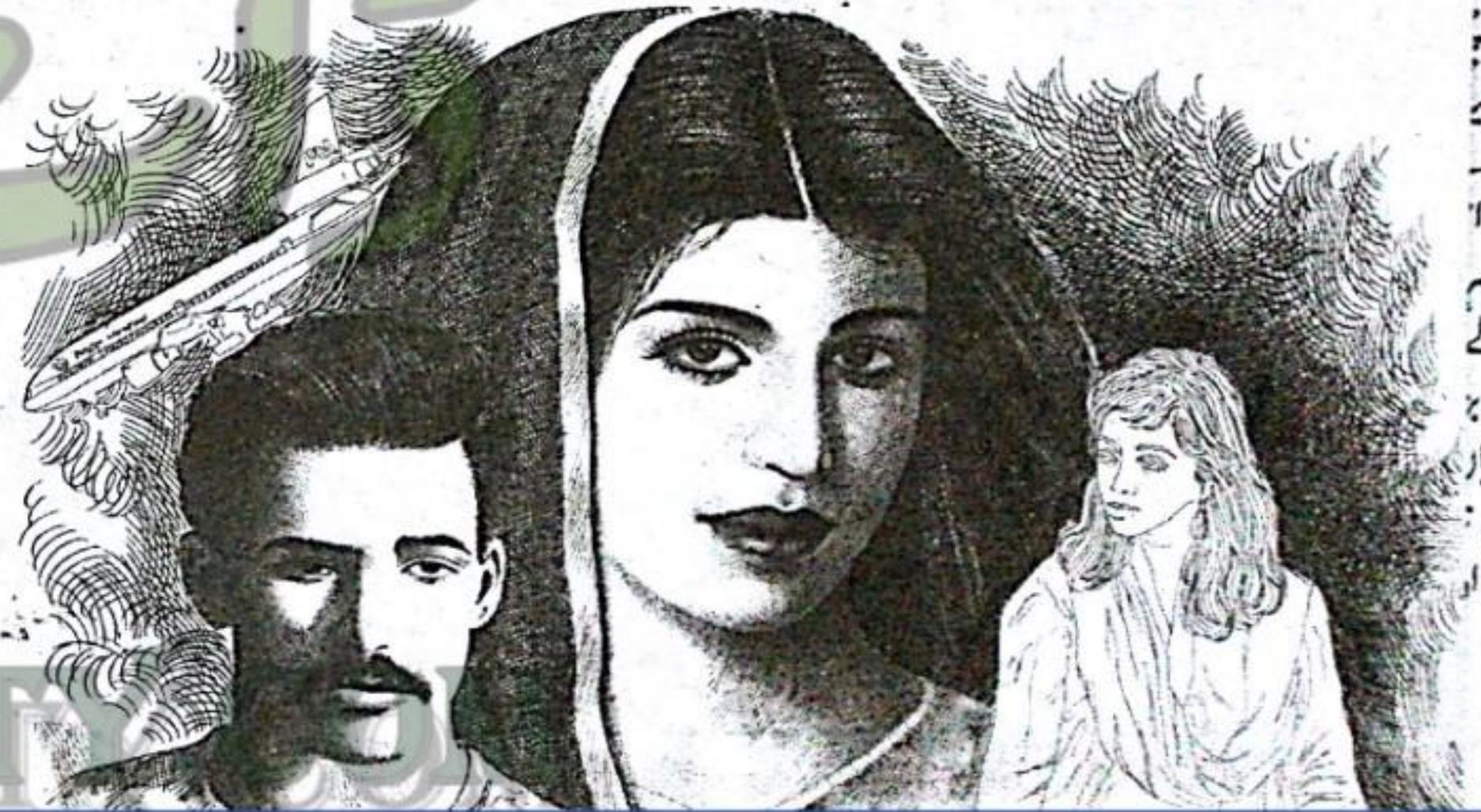
گھر کی چلی منزل میں ان کے تایا اور تائی اپنی دو بیٹیوں عفت اور نائلہ کے ساتھ رہتے ہیں۔ تایا اکثر بیمار رہتے ہیں۔ حدید، انس، عفت اور نائلہ کے خالہ زاد ہیں۔ نائلہ، انس میں دلچسپی رکھتی ہے۔ مگر انس، سوبا سے شادی کرنا چاہتا ہے اور اپنی پسندیدگی کا اظہار اپنی خالہ اور سوبا کی مائی کے سامنے کر دیتا ہے۔ خالہ کو بے پناہ دکھ کا احساس ہوتا ہے، مگر بظاہر راضی خوشی اس کا رشتہ لے کر اپنی دیورانی کے پاس جاتی ہیں۔ سوبا کی والدہ یہ رشتہ خوشی خوشی قبول کر لیتی ہیں۔ نائلہ باقاعدگی سے اپنے والد کو اسپتال لے کر جاتی ہے۔ وہاں اسپتال کے کلرک شبیر حسین عرف شبوسے روابط بڑھ جاتے ہیں کہ اچھے برے کی تمیز کو بھول جاتی ہے۔

سوبا اور انس کی شادی کی تقریبات بہت اچھے طریقے سے انجام پاتی ہیں اور سوبا رخصت ہو کر انس کے گھر آ جاتی ہے۔ حدید کسی کو ڈراپ کرنے جاتا ہے اور اس کا ایکسیڈنٹ ہو جاتا ہے۔

سوبا کے اکیلے پن کی وجہ سے عفت اس کے پاس رک جاتی ہے۔ گھر کے کاموں کے علاوہ حدید کا بھی خیال رکھتی ہے۔ حدید، عفت کے دل میں اپنے لیے پسندیدگی کو جان لیتا ہے اور سوچ لیتا ہے کہ اس بار خالہ کو مایوس نہیں کرے گا۔ نائلہ، شبیر حسین سے ملنا نہیں چھوڑتی اور آخر کار اپنی عزت گنوا بیٹھتی ہے، جس کا اندازہ اس کی ماں کو بھی ہو جاتا ہے اور وہ اپنی عزت بچانے کے لیے حدید کے ساتھ نائلہ کی شادی کا فیصلہ کر لیتی ہیں اور اس بات کا اظہار انس اور مایا سے بھی کر دیتی ہیں۔

آٹھویں قسط

(اب آگے پڑھئے)



وہ ماہ سے ملنے کے لیے گھر سے نکل چکا تھا۔ لیکن اس کا ذہن ابھی تک وہی میں اپنے فلیٹ میں ہونے والی گفتگو میں اٹکا ہوا تھا۔ جس میں اس نے ڈینی کو صاف الفاظ میں بتا دیا تھا کہ پاکستان سے واپسی پر اسے اپنا فلیٹ خالی چاہیے۔ وہ فوراً ہی راضی ہو گئی تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس نے ایک عجیب خواہش کا اظہار کیا تھا۔ وہ اپنے اور حبیب کے بیٹے سے ملنا چاہتی تھی۔ یہ کائنات کی سب سے بڑی سچائی تھی کہ حبیب اور اس کا آپس میں کوئی رشتہ نہیں تھا۔ لیکن یہ بھی ایک شرمناک، کڑوی اور ڈراؤنی حقیقت تھی کہ وہی ان دونوں کی ہی اولاد تھا۔

وہی جو اس کا بیٹا تھا۔ اس کی شخصیت کا جھول تھا۔ اس کے کردار کا داغ تھا۔ یہ وہ جھول تھا جو زندگی میں کسی بھی رشتے کے دھاگے کو کاٹنے، گرہ لگانے یا بل دینے سے جانے والا نہیں تھا۔ یہ وہ داغ تھا جو لوہے سے دھونے کے بعد بھی مٹنے والا نہیں تھا۔ لیکن وہ اس کی اپنی اولاد تھا۔ وہ اسے اون نہیں کرتا تھا۔ لیکن اس کی سرپرستی سے ہاتھ بھی نہیں اٹھا سکتا تھا۔

”تم اس سے کیوں ملنا چاہتی ہو۔“

”میں۔ میں اسے بتانا چاہتی ہوں کہ میں اس کی بد نصیب ماں ہوں۔ جس نے اسے جنم تو دیا لیکن اپنی متانہ دے سکی۔“

”ہرگز نہیں۔ میں یہ کبھی نہیں چاہوں گا اسے پتا چلے کہ اس کی ماں تم ہو۔“ اس کے لہجے میں نفرت تھی۔ گھن تھی۔

”تم۔ تمہیں یقین کیوں نہیں آتا حبیب۔ میں اپنی پچھلی زندگی کو بہت پیچھے چھوڑ آئی ہوں۔ اپنے شوہر سے شادی کرنے کے بعد میں نے ہر غلط اور برا کام چھوڑ دیا۔ اور یہی بات میرے شوہر کو پسند نہیں آئی۔ میں اس سے

نیکی نے زوردار طریقے سے بریک لگایا تھا۔ اس کے خیالات کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ وہ وہاں سے نکلنے سے پہلے بہر الحال ڈینی کو اس کے بیٹے کے لیے معذرت کر آیا تھا اور بھرپور تاکید بھی کہ وہ اس کے لوٹنے سے پہلے اپنا بندوبست کہیں اور کر لے۔

دو منزلہ چھوٹی اور پرانی عمارت والا گھر جو کہ اس کا سرال تھا سامنے ہی تھا۔

”تم۔“ نائلہ کے منہ سے چیخ سی نکل گئی۔

”ہاں تو۔! تم تو ایسے حیران ہو رہی ہو جیسے بھوت دیکھ لیا ہو۔“ وہ اپنے ازیلی اطمینان سے کھڑا تھا۔

”اندر تو بلاؤ کی ناں آج۔ دیکھو انکار نہیں کر سکتی تم۔ کیونکہ میں نے تمہارے اس چغہ شوہر کو گھر سے نکلتے دیکھ لیا تھا۔“

نائلہ کے پیروں تلے سے حقیقی معنوں میں زمین سرکنے لگی۔ شبیر حسین آج یوں دروازے سے نکلنے والا نہیں تھا۔ وہ خوب اچھی طرح دیکھ بھال کر پکا بندوبست کر کے آیا تھا۔ اس نے خود کو سخت بے بس محسوس کرتے ہوئے اسے راستہ دیا۔

”جلدی بولو کیا کام ہے۔“ وہ اندر آکر لاؤنج کے صوفے پر پھیل کر بیٹھ گیا۔ جبکہ نائلہ دہلیز پر ہی ایسے کھڑی تھی۔ جیسے شبیر کے بجائے وہ خود وہاں سے نکل بھاگنے والی ہو۔

”بتا دوں گا کام بھی۔ اتنی جلدی کیا ہے۔“

”جلدی ہے شبیر حسین۔ تم کیوں نہیں سمجھ رہے۔ یہ سرکاری ہسپتال یا تمہارے کسی جاننے والے کا وہ فلیٹ نہیں جہاں پر تم۔“

اس نے جان کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ مگر وہی ادھورا جملہ اسے جیسے پورا مزادے گیا۔

”جہاں پر میں۔ کیا۔“ اس نے شرارتی انداز میں اسے چھیڑا۔ نائلہ کو آگ ہی لگ گئی۔

”جہاں تم نے انسان سے حیوان کا روپ دھار کر مجھے نوح کھایا تھا۔“ وہ پھنکاری۔ شبیر حسین بے ساختہ ہنسا۔

جیسے اس کی بات نے اسے بڑا مزادیا ہو۔

”ہاں بات تو تم نے ٹھیک کی۔ جب ہی سے تو مزا لگ گیا ہے مجھے۔ تیرا ہوم نہ لگ گیا ہے میرے۔“ نائلہ سر جھٹک کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔ پھر بولی۔

”جلدی کام کی بات کرو اور نکلو یہاں سے۔“

”لے جلدی کس بات کی ہے تجھے۔ چل جاری ہے تو جلدی کر لیتے ہیں۔“

وہ اٹھ کر اس کے نزدیک آیا۔ اتنے نزدیک کہ نائلہ بے ساختہ ایک قدم پیچھے ہٹنے پر مجبور ہو گئی۔ اور عین اس وقت جب وہ اس سے دور ہو رہی تھی۔ اس کا بازو شبیر حسین عرف شبو کی انگلیوں کے کھانچے میں فٹ ہو گیا۔

”اندازہ تو ہو گا تجھے میں کس کام سے آیا ہوں تیرے پاس۔“

اس نے اسے بازو سے پکڑ کر خود سے قریب کیا۔ نائلہ کی آنکھیں پھٹ گئیں۔

”نن۔ نن۔ نن۔ نہیں۔ نہیں میرا ہاتھ چھوڑو۔ تم ایسا نہیں کر سکتے۔“ وہ ایک دم دہشت زدہ سی ہو گئی۔ اور بری طرح اپنا بازو چھڑانے کے لیے کسمپاسی۔ لیکن اس کی گرفت مضبوط تھی۔ وہ بے بسی سے پھر پھڑا کر رہ گئی۔

”خبردار تجھے ہاتھ مت لگانا۔ میں شور مچا دوں گی۔ تم مجھے۔“

باقی الفاظ حلق میں گھٹ گئے۔ اس نے اپنی ہتھیلی اس کے منہ پر جما کر اسے دیوار سے لگا دیا۔ وہ بے جان پتلے کی مانند دیوار سے چپک گئی۔

”زیادہ آواز نہ کرنے کی کوشش مت کرنا ورنہ۔“

اس کا ہاتھ قمیص کے اندر رینگ گیا اور جب باہر نکلا تو اس میں ایک تیز دھار پھل والا چاقو چپک رہا تھا۔

”یہ دیکھ رہی ہے ناں۔ زندگی بھر کے لیے خاموش ہو جائے گی۔“ اس کی آنکھوں میں سفاکیت، درندگی کی حدوں کو چھو رہی تھی۔ اور نائلہ کو اپنی جان، جسم کے پتھرے سے نکلتی دکھائی دے رہی تھی۔

”چل، اب شرافت سے ادھر۔ چل۔“ اس نے نائلہ کے پھرائے ہوئے بے جان جسم کو آگے دھکیلا اور سامنے ہی نظر آتے اس کے بیڈ روم میں لے جا کر بیڈ پر دھکیل دیا۔

چھوٹے سے گھر کے اوپری پورشن میں آج ہمارا تر آئی تھی۔

امی خدا کے حضور شکرانہ ادا کرتے نہیں تھک رہی تھیں۔ کہاں تو دن رات انہیں یہ فکر کھائے جاتی تھی کہ ان کی بیٹیوں کا مستقبل کیا ہو گا اور کہاں یہ دن کہ ان کے دونوں داماد ساری پریشانیاں اور مسئلے مسائل ختم کر کے ان کے اپنے چھوٹے سے گھر میں بیٹھے ہنس بول رہے تھے۔

نیچے سے عفت اور تائی جان بھی اوپر ہی آگئی تھیں۔ اور تو اور۔ آج تو تائی جان بھی سیڑھیاں چڑھ آئے تھے۔

عفت خوب تیزی پھرتی سے امی کے ساتھ کھانے کے انتظام میں لگی ہوئی تھی۔ بظاہر تو وہ بھی سب کے ساتھ ہنس بول رہی تھی۔ لیکن اس کا دل اور دماغ الگ الگ بھاگے دوڑے پھرتے تھے۔ وہ اپنی غائب دماغی کو قابو کرنے

اس نے اس کی ہر کوشش پر اپنی بے رخی بیگانگی اور اجنبیت سے پانی پھیر دیا۔ اس نے جتنا اس کے قریب ہونے کی کوشش کی وہ اس سے اتنا ہی دور بھاگی۔ کیوں؟ اس کا جواب شاید وہ ایک حد تک جانتا تھا کہ وہ اس کو چاہتی تھی۔ بالکل اسی طرح جس طرح وہ نائلہ کے بجائے اس کی بہن کو اپنا ناچا جانتا تھا۔ نائلہ بھی اس کے بجائے اس کے بھائی کی زندگی میں آنا چاہتی تھی۔

ایسا تو ہو نہیں سکا۔ تو چلو۔ جو بھی ہوا۔ جیسا ہوا۔ اسے قسمت کا لکھا اور رب کی رضا سمجھ کر جب اس نے سمجھو تا کر لیا۔ تو وہ کیوں نہیں کر رہی۔ کیوں نہیں کر سکی اور کیوں کرنا نہیں چاہتی۔ یوں اپنے اور اس کے بیچ دوری کی تمام نماد دیوار کھڑی کر کے وہ آخر کس بات کا انتظار کر رہی تھی۔ اور یہ سلسلہ کب تک چلنا تھا۔ ظاہر ہے ساری زندگی تو نہیں چل سکتا تھا۔

”مجھے نائلہ سے صاف صاف بات کرنی ہی ہوگی۔“

آفس کا ٹائم ختم ہونے والا تھا۔ اس نے بے حد تھکے ہوئے انداز میں اپنی جلتی ہوئی آنکھوں کو مسلا اور سامنے رکھے کمپیوٹر پر نگاہیں جمادیں۔

رات اپنا کافی سفر طے کر چکی تھی۔ لیکن نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ وہ بے حد محبت بھری نگاہوں سے اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ جو اس پر اپنی بے حد و حساب چاہتیں لٹا کر نیند کی بوادیوں میں اتر گیا تھا۔ کتنے دن کے بعد کتنے صدیوں جیسے پل کتنے سالوں جیسے گھنٹے بتا کر ان بانسوں کا گھیرا اور ان سانسوں کی ہر حدت اور خوشبو کو اس قدر قریب سے محسوس کیا تھا اس نے۔ وہ جانے کب تک یونہی محبت بٹاش نگاہوں سے وہ مہمان چہرہ دیکھتی رہتی۔ معاں اس کی آنکھ کھل گئی۔ اسے یوں خود کو اتنی محبت سے تکتا ہوا دیکھ کر وہ جیسے سے مسکرایا۔

”کیا ہوا۔ نیند نہیں آرہی کیا۔“

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بس یونہی خاموشی سے مسکرا کر اسے دیکھتی رہی۔ اس نے واپس نیند میں جانے سے پہلے بند ہوتی آنکھوں کو کھولا۔ پھر اس کی پیشانی پر بوسہ لیا۔

”سو جاؤ جان۔ پھر صبح بتا نہیں دیر تک سونے کو ملے یا نہیں۔“

اس نے ایک گہری پرسکون سانس بھر کر آنکھیں بند کر لیں۔ لیکن صرف چند لمحوں کے فرق سے اس کی جڑی ہوئی پلکیں الگ ہو گئیں۔

حسیب کے سیل پر کوئی میسج آیا تھا۔ اس نے سائیڈ ٹیبل سے اس کا موبائل اٹھایا۔ کسی انجانے نمبر سے آیا ہوا میسج۔ شاید دینی سے۔

”حسیب، ہنی! اس می ڈینی۔ اگر تم جاگ رہے ہو تو پلیز بتا دو کہ کافی کہاں رکھی ہے۔ میں نے سارے کیمپنٹس دیکھ لیے کہیں نہیں مل رہی۔“

نہ کوئی بجلی گری تھی نہ آندھی آئی نہ طوفان۔ بس چند لمحوں پہلے کا محبت بھرا فیسول اچانک غائب ہو گیا۔ اس کے مسکراتے ہوئے لب سکڑ گئے۔ ماتھے پر شکنیں ابھر آئیں۔ اس نے ایک بے یقین نظر اطمینان سے سوتے ہوئے حسیب پر ڈالی اور اسی بے یقین کیفیت میں ٹیکسٹ ٹائپ کرنے لگی۔

”شاید کافی ختم ہو گئی تھی۔ تم جا کر اسٹور سے لے آؤ۔“

”اس ٹائم؟ تم اگر پہلے بتا کر جاتے تو میں ملا کر رکھ لیتی۔“

میں ناکام ہوئی جا رہی تھی۔ اس اور حسیب کے درمیان جو بھی اختلافات تھے۔ اتنے بہت سارے دنوں کے بعد ملنے پر انہوں نے ان کا ہلکا سا شائبہ بھی اپنے درمیان آنے نہیں دیا تھا۔ فی الحال تو دونوں ہنسی مذاق کرنے اور قہقہہ لگانے میں مصروف تھے۔

ماہ کے دل میں ایک خوشی بھرا اطمینان ہلکورے لے رہا تھا۔ اس نے حسیب کے قیمتی موبائل سے اپنی آفس اور سوا کی امی اور عفت کی اپنی اور حسیب کی مل کے ڈھیروں تصویروں کھینچیں۔ خوب رونق پٹے گلے میں دوپہر کا کھانا کھایا گیا۔ سوا اور ماہ کو یوں خوش باش دیکھ کر نائلہ کی یاد آتی تو ایک لمبی کاسا احساس ہوتا۔ ساتھ ہی وہ مسکرا بھی یاد آجاتا۔ اس کے دل میں کوئی چنگیاں بھرنے لگتا۔ دل میں خود بخود شکوہ سا ابھرنے لگتا۔

”کیا ہو جاتا اگر نائلہ کی جگہ میں اور حسیب۔“ وہ بار بار استغفار پڑھنے لگتی۔

”نائلہ ہی حسیب کے ساتھ گزری تمام باتیں بھلا کر زندگی کی نئے سرے سے شروعات کر لیتی تو۔“

اس کی اپنی سوچیں ہی تھیں۔ اس کے اپنے تلام تھے۔ جن میں وہ بار بار ڈوب کر ابھرتی۔ پھر حاضرین محفل کو دیکھ کر ایک زبردستی کی جھجکتی ہوئی مسکراہٹ لبوں پر سجانے کی کوشش میں انہیں بس دائیں بائیں پھیلاتی۔ جو چند لمحوں بعد تاکی شعوری کوشش کے واپس سکڑ جاتے۔

سپہر کے قریب چائے پی کر اس نے سوا کو چلنے کا اشارہ کیا۔ ان کا ارادہ بھانپتے ہی حسیب بھی اٹھ گیا۔ ”آئی میں خاص طور پر ماہ سے ملنے بہت ایمر جنسی میں آیا ہوں۔ اگر آپ سائنڈ نہ کریں تو میں اس کو آپ کی سیل لے جاؤں۔ پرسوں میری واپسی ہے پھر کل ہم لوگ ذرا گھوم پھر لیں گے۔“

ای کو بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔

”اب تم آئی گئے ہو تو ماہ کو بھی ساتھ ہی لے جاؤ ناں۔“

تائی جان نے اچانک ہی امی کے دل کی بات کر دی۔ کمرے کی رونق بھری چہلوں میں لمحہ بھر کو وقفہ آگیا۔

”جی جی ہاں۔ ضرور۔“ حسیب کچھ گڑبڑا سا گیا۔ پھر تھوڑا سا کھنکار کر بولا۔

”اگر ماہ چاہے گی تو پرسوں میرے ساتھ ہی۔“

”سوا تم کوئی سامان بھول کر تو نہیں جا رہی؟“

ماہ نے جان بوجھ کر اس کی بات کاٹ دی اور سوائے خود تائی جان اور تائی کے سب ہی نے اس بات کو محسوس کیا۔ امی نے تو باقاعدہ ماہ کو گھوری تک دے ڈالی۔

اسی گھر میں اسی گہری دو بیٹیاں جہاں اپنے گھروں کو واپس لوٹ رہی تھیں۔ وہیں ایک بیٹی ایسی بھی تھی۔ جو اکیلے گھر میں تنہا اپنی بدنصیبی سے نبھو آزا۔ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

آفس میں اس کی غیر حاضر دماغی کو پاس سے لے کر چڑا سی تک سب ہی نے محسوس کیا تھا۔ اس کا خود پر سے اختیار ختم ہو گیا تھا۔ دماغی روبہلک کر ٹھہر کر رک کر پلٹ کر ایک ہی سمت کو بھاگتی تھی۔ اور دو چہروں پر جھمتی تھی۔

ایک نائلہ اور دوسری عفت۔

وہ عفت کو چاہتا تھا لیکن اسے پا نہیں سکا۔ اس نے نائلہ کو پایا۔ اپنا یا اور اپنا ہانے کی بہت کوشش کی لیکن نائلہ۔

اتنی بے تکلفی۔ یہ انداز مخاطب۔ وہ بھی ہوئی آنکھوں سے آنے والا مسیح پر رہی تھی۔ کوئی بے یقینی سی بے یقینی تھی۔ حسیب کے فلیٹ پر کوئی عورت رہ رہی تھی۔ اور حسیب اسے وہاں چھوڑ کر ماہ سے ملنے آیا تھا۔ ہزاروں سوال کیوں؟ کیوں؟ کیوں؟ لیکن کیوں؟ اور جواب نہ دار۔

سورج کی شعاعیں سیدھے چہرے پر پڑ کر اسے بے دوار کر گئی تھیں۔
”اول ہونہ۔ یہ کھڑکی کیوں کھول دی ماہیا را سے تو بند کر دو۔ کتنی تیز دھوپ آ رہی ہے۔“ اس نے تکیے میں منہ تھمیزا۔ پھر بے چینی سے اسے دیکھا۔ جواب نکل سامنے اس کی جانب پشت کیے ڈرنگ کے آگے بیٹھی تھی۔
”ماہی میں تم سے کچھ کہہ رہا ہوں۔“ کوئی جواب نہ پا کر اس نے پھر دیکھا۔

”کیوں کھولی ہے۔ دو بند کر دیا۔“
”آپ کو جگانے کے لیے کھولی ہے۔ تاکہ آپ کے ہوش و حواس ٹھیک طرح سے بے دوار ہو جائیں۔“ اس کی آواز بھاری غم اور بھرائی ہوئی تھی۔ حسیب ایک دم چونکا۔
”تم رورہی ہو۔ کیوں۔ ماہا کیا ہوا ہے؟“

وہ چند لمحے یونہی بیٹھی رہی۔ پھر پلٹی اور ہاتھ میں پکڑا اس کا سیل فون پیٹنے کے سے انداز میں اسے کھینچ مارا۔

شام گہری ہو کر رات کے آنچل میں چھپ رہی تھی جب وہ لوگ گھر پہنچے پوری گلی میں صرف ایک ان ہی کا گھر تھا جو مکمل اندھیرے اور خاموشی میں ڈوبا ہوا تھا۔ گیٹ پر کھڑے ہو کر اتنی بار بیل بجائی بڑی کہ گھبراہٹ سی ہونے لگی۔ اس دن یہ اتفاقی ہی تھا کہ انس کھڑکی ڈپٹی کیٹ چابی اپنے ساتھ لے جانا بھول گیا تھا اور گھبراہٹ جب تشویش میں بدلنے لگی تب محسن میں لگا انرجی سیور جل اٹھا۔ چند لمحوں بعد دروازہ کھول کر نالہ انتہائی بجلت میں پلٹ گئی۔

انس اور سہا دونوں نے ہی بطور خاص اس کا یہ انداز نوٹ کیا۔ سہا نے اس ایک لمحے میں جب وہ پلٹ رہی تھی اس کا سرخ اور سوجا ہوا منہ بھی دیکھ لیا تھا۔ جیسی چند قدم کے محسن پار کر کے برآمدے میں قدم رکھتے ہی اس کے منہ سے نکلا۔

”اسلام علیکم! نالہ کیا بات ہے۔ تمہاری طبیعت ٹھیک ہے۔“
تیر کی طرح تیزی سے واپس اپنے کمرے میں گھس کر نالہ دہلیز پر رک گئی۔
”نہیں۔“ اس کی آواز بیٹھی ہوئی تھی۔ جیسے بہت دیر روتی رہی ہو۔

”کیا ہوا طبیعت کو۔“ اس نے آگے بڑھ کر نالہ کو اپنی طرف گھمایا۔ اور وہ گھٹنوں سے جیسے کسی ہمدرد کندھے کی تلاش میں تھی۔ یکدم ہی سہا کے کندھے سے آن لگی۔ اور اس بری طرح بکھر کر رہی کہ سہا تو سہا خود انس بھی گھبرا گیا۔

وہ جلدی سے اس کے لیے پانی لے کر آیا۔ سہا نے اسے صوفے پر بٹھایا اور اس کا سر تھکے لگی۔ نالہ کا اس طرح بے قراری سے تڑپ کر دنا دونوں کی سمجھ سے باہر تھا۔ نہ تو وہ اتنی نازک تھی اور نہ اس کے اعصاب۔
پانی پی کر جب ذرا طبیعت ٹھہری تو اس نے سوالیہ نگاہوں سے دونوں کو اپنی طرف تھکایا۔

”نہیں۔“ اب سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا جواز پیش کرے۔
”اتنے دن سے گھر میں اکیلی تھی اور آج صبح حدید بھی ناراضی کے عالم میں جو نکلے تو اب تک واپس نہیں آئے۔ مغرب کا وقت تھا میں ڈر گئی تھی۔“

ماہنامہ کرن 212 جولائی 2015

”لیکن۔۔۔ تمہارا تو پورا منہ سوج رہا ہے۔ آنکھیں کتنی سرخ ہو رہی ہیں۔ ایسا لگ رہا ہے جیسے تم بہت نہیں کب سے اور کتنا رو چکی ہو۔“

سہا کی آواز میں حقیقی تفکر اور خلوص چھلک رہا تھا۔ انس البتہ اب تک خاموش تھا۔ نالہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کے پاس کوئی جواب تھا بھی نہیں۔

”چلو نیند کی گولی کھا کر آرام کرو۔ میں آگئی ہوں میں حدید بھائی کو سمجھا دوں گی۔ وہ ناراضی ختم بھی کر دیں گے اور تمہیں ڈسٹرب بھی نہیں کریں گے۔“

سہا اسے تسلی دینے والے انداز میں مسکرائی۔ نالہ کے دل میں ایک بار پھر حسد اور رشک کے طے جلے جذبات ابھرے۔

وہ اٹھنے لگی تھی تب اس کی نظر انس پر پڑی۔

وہ صوفے کے پاس پڑا ہوا کوئی مڑا تڑا کاغذ اٹھا رہا تھا۔ نالہ کی سانس اٹکنے لگی۔ یہ موٹا کاغذ اور اس کے اندر لپٹی چمکی پن اس پان کی تھی جو شبیر حسین نے یہاں آنے کے بعد کھایا تھا اور لا پرواہی سے پھینک دیا تھا۔ کاغذ اور سنہری پن پر لگے کتھے کے نشانات واضح تھے۔

انس نے چند لمحے کاغذ کو غور سے دیکھا پھر پتا کچھ کہے ڈسٹ بن میں ڈال دیا۔ نالہ کی انکی ہوئی سانسیں بحال ہوئی۔ وہ تیزی سے کمرے میں گھس گئی۔

حسیب ماہا کو گھر چھوڑ کر ایئر پورٹ کے لیے نکل گیا تھا۔

پورے وجود پر اداسی افسوس اور پشیمانی طاری تھی۔ وہ کچھ نہ کر کے بھی ایک بار پھر مجرم، بلکہ ملزم سے مجرم بن چکا تھا۔ اسے اپنے اور ماہا کے تعلقات پر اپنی سچ پر لانے کے لیے جتنی محنت کرنی پڑی تھی سب بے کار گئی تھی۔

اسے گھر واپس چھوڑتے وقت اس کے وہی انجان انداز تھے۔ غم آنکھیں روٹھا چہرہ اور گم آواز۔ نہ اس نے کوئی صفائی مانگی۔ نہ اس نے خود کو کسی وضاحت کے قابل سمجھا۔ اب کی بار بدگمانی کی دھول نہیں۔ آندھی چلی تھی اور ماہا کا دل دماغ عقل سب کچھ اس آندھی کی سرخ مٹی میں منوں وزن تلے بچ چکا تھا۔

ایئر پورٹ نزدیک ہی تھا۔ جب اچانک اس کے خیالات کو ایک جھٹکا لگا۔ کیب رگ چکی تھی۔ وہ نا سمجھی سے سامنے آ جانے والے ان موٹر سائیکل سواروں کو دیکھنے لگا۔ جو افرا تفری کے عالم میں اس سے کچھ کہہ رہے تھے۔
جتنی دیر میں حسیب ان کی بات سمجھا ان میں سے ایک نے حسیب کے ہاتھ میں دیا موبائل بچھا۔ حملہ بے حد غیر متوقع تھا۔ حسیب نے بے اختیار مزاحمت کی۔

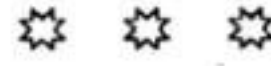
ڈرائیور دو سرے لڑکے کے گن پوائنٹ پر تھا۔
حسیب نے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی۔ بس لمحہ بھر کی بات تھی۔ لڑکے نے ٹریگر دبا دیا۔ فضا میں یکے بعد دیگرے دو فائر ہوئے۔

انہوں نے ٹیکسی میں لدا ہوا دو سراسامان گھسیٹا اور خون میں لیت پیت جسم کو وہیں چھوڑ کر فرار ہو گئے۔ پوری گاڑی ڈرائیور اور حسیب کے گاڑھے سرخ خون سے بھرتی جا رہی تھی۔

وہ کتنے دن کے بعد اس کمرے میں انس کے ساتھ داخل ہوئی تھی۔ اندر قدم رکھتے ہی رنگ برنگی سوچوں نے اس کا ہاتھ تھام کر آنکھوں میں آنکھیں ڈالنی چاہیں۔ لیکن اس کے دھیان کے پردے پر کوئی اور ہی منظر ان یادوں

ماہنامہ کرن 213 جولائی 2015

وہ اپنی بات دہرا کر وہیں سے واپس پلٹ گئی۔ انس نے مڑ کر سوبا کو دیکھا۔ پھر اس کے نزدیک آیا۔
 ”یہ نالکھ کو کیا ہوا ہے۔“ اس نے سرگوشی کی۔
 ”پتا نہیں۔“ جواب بھی سرگوشی میں آیا۔
 انس معصوم سامنے ہٹا کر سوبا کی طرف جھکا۔ سوبانے اسے پیچھے دھکیلا پھر دروازہ کی طرف موڑا پھر پشت پر ہاتھ رکھ کر دھکیل دیا۔ انس ڈھیلے پن سے آگے بڑھتا چلا گیا۔



اس نے جھکی جھکی نگاہوں سے ان کے جھریوں بھرے سانولے ہاتھ دیکھے۔ دس میں سے چار انگلیوں میں سونے کی انگوٹھیاں تھیں۔ جوان کے سانولے ہاتھوں سے ذرا بھی میل نہیں گھا رہی تھیں۔ چھوٹی سی ٹرے میں چائے کے دو کپ اور بسکٹ کی پلیٹ رکھے۔ وہ جھکی۔ ٹرے اماں اور ان کے درمیان ہی مسہری پر نکادی۔ اس کے سیدھے ہونے سے پہلے ہی وہ ہاتھ اس کے سر پر آن ٹھہرا۔
 ”جیتی رہو۔ خوش رہو۔ اللہ نصیب کھولے۔ جلدی سے اچھا سا بر ملائے اپنے گھر کا کرے۔“ خاتون کے منہ سے دعاؤں کے پھول جھڑے۔ اور کمرے کا ماحول مہک گیا۔
 ”یہی ہے میری بیٹی عفت۔ ماشاء اللہ سے بہت فرما بیروار اور سکھڑ ہے۔ آپا اب تم سے کیا چھپانا۔ بس۔“ وہ سر پر سے ہاتھ ہٹتے ہی پلٹ کر کمرے سے نکل آئی۔
 گھر کی تینوں لڑکیاں بیانی گئی تھیں۔ بس اب صرف ایک ہی باقی تھی۔ اس کی فکر نے ہی اماں کی نیندیں اڑا رکھی تھیں۔ وہ خود تو سارا دن گھر میں ہی رہتی تھی۔ نہ کہیں آتا نہ جاتا نہ ملنا ملانا۔ خاندان کی تقریبات میں بھی ابا کی وجہ سے بھی جانا ہو جاتا تھا۔ اور کبھی نہیں۔
 اماں کے بقول ”اس گھر کی دلیز تو کوئی رشتہ پھلانگتا ہی نہیں۔ پرانے وقتوں میں بیوی پکتی نہیں تھی کہ پتھر گرنے شروع ہو جاتے تھے اور اب۔“
 کبھی کبھی وہ عفت کی موجودگی کا لحاظ کیے بغیر کبھی چچی تو کبھی ابا کے سامنے شروع ہو جاتیں۔
 عفت بس ایک پھرانی ہوئی سی کیفیت کے ساتھ اماں کے تبصرے اور تجزیے سنتی رہتی۔ کل ماہا اور سوبا کے اپنے گھروں کو چلے جانے کے بعد رات میں اماں نے ہمت پکڑی اور محلے کے ہی کسی گھر سے کہہ سن کر وچون کو بلوا بھیجا۔ یہ وچون جسے پورا محلہ نسیم خالہ کے نام سے جانتا تھا۔
 محلے کے کئی گھروں میں رشتے کروا چکی تھی۔ سنا تھا۔ کافی کھاتے پیتے علاقوں میں بھی اس کا آنا جاتا تھا۔ بہت سے ایسے گھرانے جہاں اسے بہت امید اور آس کے ساتھ بلایا جاتا تھا۔ رشتہ طے ہو جانے سے لے کر شادی کی کامیابی تک کے مرحلوں میں اسے خوب نوازتے تھے۔ رشتہ ریکا ہو جانے کی صورت میں اس کی اپنی فیس بھی تھی۔ جس کی وصولی میں وہ ذرہ برابر بھی مروت نہیں دکھاتی تھی۔ لیکن بے چاری مزاج اور طبیعت کی بہت اچھی تھی۔ با اخلاق اور ملنسار اور کچھ اس کے پروفیشن کا تقاضا بھی تھا۔ لیکن اس کا اپنا کہنا یہ تھا کہ جس طرح اس نے اپنی تین بیٹیوں کے رشتوں کے لیے بیوگی میں بھاگ دوڑ کی۔ شادی کروانے میں جس طرح دھول پھاکی اس سے یہ سبق سیکھا کہ اگر میری ذرا سی محنت سے کسی کی بیٹی اپنے گھر کی ہو جائے تو آخرت کے لیے سودا منگا نہیں۔
 یہی وجہ تھی کہ اماں کے ایک بلاوے پر وہ بلا حیل و حجت چلی آئی تھی جبکہ جانتی تھی کہ یہاں سے مال ملنے کی کوئی امید نہیں۔
 عفت نے بارہو رچی خانے میں آکر ایک گہری سانس لی۔ چولہے پر چڑھی مسور کی دال میں سے اڑتی بھاپ کو

ماہنامہ کرن 215 جولائی 2015

کو پڑے ہٹا کر آن کھڑا ہوتا۔
 وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس منظر میں ڈوب ڈوب جاتی۔
 سب سے پہلے جا کر جب اس نے ڈریسنگ میں اپنا سر لپا دیکھا اور پشت پر ابھرتے انس کے عکس کو دیکھ کر دھیمے سے مسکرائی تب انس جواباً ”مسکرا کر واش روم چلا گیا۔ تب۔“
 اس نے چوڑیاں اتاریں، میک اپ جو کہ بہت ہلکا ہی تھا۔ بے دھیانی میں ٹشو سے رگڑتے ہوئے۔ اور اس کے بعد ہی بیوٹا انار کر اس کو تڑ کر کے بار بار واپس کھولتے ہوئے، انس کے نکل کے آنے کے بعد بھی وہ اسی سوچ میں گم تھی کہ آج آخر نالکھ کو ہوا کیا تھا۔
 ”کیا بات ہے۔ کن خیالوں میں گم ہیں بیگم صاحبہ!“
 انس اسے مخاطب کرتے ہوئے بہت فریٹش تھا۔ سوبانے چونک کر اسے دیکھا۔ پھر ایک دم تازہ دم ہو کر مسکرائی۔
 ”کچھ نہیں بس ایسے ہی۔“
 وہ بیڈ کے پاس کھڑی تھی۔ ہاتھ میں دوپٹا تھا۔ قریب ہی انس کے برابر سے ہو کر بیڈ پر بیٹھ چکا تھا۔ اس کا دل انس کے گھر سے وجود کو دیکھ کر لمبے بھر کے لیے کھل سا گیا۔ اس نے ایک بے خودی کے سے عالم میں آگے بڑھ کر اپنے بازو اس کے کندھوں پر ٹکا کر اسے حصار میں لے لیا۔ انس اس خوب صورت سپردگی کے لیے تیار نہیں تھا۔ وہ بے اختیار اس کے محبت بھرے اس انداز پر مسکرا اٹھا۔ آج وہ بنا جھکے، شرمائے اور جھوٹی موٹی بنے بغیر سیدھا اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھ رہی تھی۔
 ”کیا دیکھ رہی ہو۔“ انس کے لیے اس کے انداز نزلے بھی تھے اور بے حد خوب صورت بھی۔
 ”سب کچھ۔“ اس کے گداز لبوں پر الفاظ چمکے۔
 ”سب کچھ۔ سب کچھ کیا۔“ وہ حیران ہوا۔
 ”آنکھیں، ناک، ہونٹ، بال سب کچھ۔“ اس کے سوبا کا انداز شرارتی سا تھا۔
 ”کیوں۔“ اس نے اپنے ہاتھ اٹھا کر سوبا کی کلائیوں پر رکھے اور انہیں دھیرے سے اپنی گرفت میں لیا۔
 ”اتنے دن بعد جو دیکھا ہے۔ کیا فرصت سے دیکھ بھی نہیں سکتی۔“ اس نے لاڈ سے شکوہ کیا۔
 ”نہیں۔ دیکھ سکتی ہو بلکہ صرف دیکھتی کیوں ہو۔ اس سے بڑھ کے بھی کچھ کر سکتی ہو۔“ بات کی تہہ میں اترتے ہی اس نے لمبے بھر میں اپنے ہاتھ پھینچے مگر اب اس کی کلائیاں انس کی گرفت میں تھیں۔
 ”کیا ہوا۔ اب کیا ہوا۔“ سوبا کی ہنسی نکل گئی۔
 ”کچھ نہیں بس دیکھ چکی۔“ وہ مسلسل اپنی ہنسی دبا رہی تھی۔
 ”تم دیکھ چکی نا! میری باری تو اب آئی ہے۔“ اس نے اس کی کلائیوں کو جھٹکا دیا۔
 ”تو آپ بھی دیکھ لیں۔“ وہ مسلسل اپنے ہاتھ موڑ موڑ کر چھڑوانے کے چکر میں تھی۔ لیکن انس کی گرفت میں ناکام ہو رہی تھی۔
 ”دیکھوں گا میں بھی۔ دیکھوں گا ہی لیکن ایسے تھوڑی۔ میں اپنے انداز سے۔“
 اس کی بات مکمل نہیں ہوئی تھی کہ دروازے پر دستک ابھری۔ اس نے بات ادھوری چھوڑ کر اس کی کلائیوں کو آزاد کیا۔ سوبا کی جلی کی سی تیزی سے دور ہو گئی۔
 ”سوبا۔ انس! کھانا کھا لو تیار ہے۔“
 باہر سے نالکھ کی آواز ابھری۔ آواز بھاری تھی۔ لیکن ہموار بھی تھی۔ انس نے اٹھ کر کمرے کا دروازہ کھولا۔

ماہنامہ کرن 214 جولائی 2015

دیکھا۔ اس کی زندگی میں خوشیاں بھی ایسی ہی دھوئیں کی مانند مرغولے بن کر فضاؤں میں کہیں اڑ گئی تھیں۔
اس نے بے دلی سے چند ایک صاف ستھری ہلکیوں کو اسٹینڈ پر آگے پیچھے کیا۔ پھر اسے محسوس ہوا کہ اس بے
معنی سے کام کے دوران اس کی آنکھیں دھندلا سی گئی ہیں۔ اس نے تیزی سے آنکھوں کو گرکڑا چند لمحوں کے لیے
منظر صاف ہوا۔ پھر فوراً ہی دوبارہ دھندلا ہٹ بھڑکی۔
وہ گرم دیکھی میں سے اٹھتی بھاپ کے سامنے منہ دے کر کھڑی ہو گئی۔ اور پھر کتنے ہی آنسوؤں کو بنا روکے بہہ
جانے دیا۔

کبھی کبھی آنسوؤں کا بہہ جانا ہی بہتر ہوتا ہے۔ مستقل دل میں جمع رکھنے سے ایسی دلدل بن جاتی ہے۔ جس میں
ہر خوشی لاکھ ہاتھ پیر مارے ڈوبتی ہی چلی جاتی ہے۔ آنسوؤں کی یہ دلدل اس قدر وحشیانہ بھوک رکھتی ہے کہ
خوشیاں ننگے ننگے پورا بندہ نکل جاتی ہے۔ آنسوؤں کو آدم خور دیکھ بننے میں دیر نہیں لگتی۔

اس نے بچن کے دروازے میں سے عفت کی قمیص کی جھلک دیکھ لی تھی۔ پھر بھی بنا سلام دعا کیے آگے بڑھ کر
سیڑھیاں چڑھتی چلی گئی۔ اوپر ای شاید ہاتھ روم میں تھیں۔ کمرے خالی تھے اور ہاتھ روم سے پانی گرنے کی آواز آ
رہی تھی۔ وہ اندر جا کر روم سے بیڈ پر بیٹھی۔ چند لمحے ضبط سے کمرے کمرے سانس لیتی رہی اور بس۔ چند لمحے
گزرے تھے کہ اس کا حوصلہ ٹوٹ گیا۔ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ یہاں اسے کوئی
دیکھنے والا نہیں تھا۔ کوئی اسے کندھا پیش کرنے والا نہیں۔ کوئی اس کے آنسو پونچھنے والا نہیں تھا۔ کوئی اس سے
آنسوؤں کا سبب جاننے والا نہیں تھا۔

کافی دیر روچنے کے بعد جب تھوڑا دل ہلکا ہوا اور اسے محسوس ہوا کہ امی اب نہا کر نکلنے والی ہوں گی تو اس نے
چہرہ صاف کیا اور بچن کے سنک سے جا کر چہرے پر پانی کے چھپاکے مارے گو کہ یہ ذرا سا پانی اس ڈھیر سارے پانی
کے اثرات مٹانے میں ناکام تھا۔ جو اس نے کمرے میں آنسوؤں کی شکل میں بہایا تھا۔ پھر بھی چند گھونٹ چلو میں
بھر کر حلق میں اتار لینے سے اس نے خود کو امی کے سامنے کرنے کے لیے تیار کر لیا۔

امی ابھی نہا کر نکلیں گی تو اسے سامنے دیکھ کر حیران تو ضرور ہوں گی۔ سوالات کریں گی۔ پھر تشویش کا اظہار
کریں گی۔ ان سارے مرحلوں سے بخیر و خوبی نمٹتے ہوئے اسے امی کو کس طرح مطمئن کرنا ہے کہ انہیں محسوس
نہ ہو کہ اس کے اور حسیب کے درمیان پھر سے کوئی ناچاقی ہو گئی ہے۔ اس نے خود کو ذہنی اور جسمانی طور پر تیار
کرنے کے لیے ہونٹوں کو دائیں بائیں پھیلا کر مسکرانے کی کوشش کی۔ لیکن یہ کوشش بہت بھونڈی ثابت
ہوئی۔ کیونکہ اتنی تیزی سے اس کی آنکھوں میں نمی ابھری کہ اس نے خود کو احمق محسوس کیا۔

آنکھیں صاف کر کے گہری سانس لی۔ چہرہ تھپتھپایا۔ اور پلٹ کر پھر گلاس میں پانی لینے لگی۔
امی نہا کر نکلیں تو اس نے سلام میں پہل بھی کی اور جلدی بھی۔ وہ اس کا سلام سن کر کہیں۔ ٹھنک گئیں۔
”وعلیکم السلام! تم کب آئیں۔“

”ابھی تھوڑی دیر پہلے۔“ اس نے چہرہ چھپانے کے لیے گلاس منہ سے لگایا اور بچن سے نکل کر درمیانی فاصلہ
عبور کر کے کمرے کی طرف چلی گئی۔ اس نے جتنا سرسری انداز میں جواب دیا تھا۔ امی اتنی ہی تشویش بھری نظروں
سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

ماؤں کی آنکھوں میں اللہ تعالیٰ نے جو ایکسے مشین فٹ کر دی ہے۔ اس کا تعلق سیدھا دل سے جڑا ہوتا
ہے۔ اولاد جسمانی چوٹ اور تکلیف ”شاید“ ماں سے چھپا سکے۔ لیکن دل میں کیا چل رہا ہے۔ یہ چھپانا تقریباً ”نا“

بہندہ کرن 216 جولائی 2015

ممکن ہی ہے۔ خاص طور پر اس صورت میں جبکہ ماں کی آنکھوں سے نکلتی ایکس ریز اولاد کی آنکھوں کی اسکرین پر
لکھی ہر زبان پڑھ سکتی ہوں۔ دل میں پھونٹے لٹو اور امیدوں کے بجھتے چراغوں کی ایکس ریز رنگ ایک آنکھ
کے اضطراب سے دوسری آنکھ پر انکشاف تک بنا کسی سنگٹل کی موجودگی کے بلا کم و کاست پہنچتی ہیں۔
اس نے نگاہیں جھکا کر اپنا ہنڈ بیگ کھگانا شروع کر دیا۔ دل کو ایک پاگل سی خوش فہمی تھی۔ یا بے وقوفوں والا
بہانہ کہ شاید اس بیگ میں سے کوئی ایسی چیز نکلے گی۔ جسے دیکھ کر امی یا تو اپنی بات بھول جائیں گی یا بہل جائیں گی۔
حسب توقع وہ فوراً ہی اس کے پیچھے کمرے میں چلی آئی تھیں۔ اور اب بے حد غور سے اس کی مصروفیت دیکھ
رہی تھیں۔

”اور حسیب کہاں ہے۔“

”وہ چلے گئے واپس۔“ اس نے بیگ سے اپنا موبائل نکالا۔

”انٹی۔۔۔ بسن کے پاس۔“ انہوں نے ذرا سی دیر کے لیے بھی اپنی نظریں اس پر سے ہٹائی نہیں تھیں۔ وہ خود بیڈ
پر بیٹھی تھی۔ وہ دروازے پر کھڑی تھیں۔ ماہا کے فرار کے سبھی راستے مسدود تھے۔
”نہیں دینی۔ ابھی مجھے چھوڑ کر ایئر پورٹ ہی گئے ہیں۔“ اس نے بے حد آرام سے کہا۔

”لو۔ تمہیں لے کر نہیں گیا۔ کل تو کہہ رہا تھا کہ اگر تم جانا چاہو۔“ ان کی بات ادھوری رہ گئی۔ ماہا بے حد
انہماک سے فون پر کوئی نمبر ملا رہی تھی۔

”میں تم سے بات کر رہی ہوں۔“ انہیں ایک دم جلال چڑھا۔
انہوں نے کیلے اچھے بالوں کا ہی جوڑا بنا لیا تھا۔ اور ایک ماتھے پر جھولتی لٹ کو جارحانہ انداز میں کان کے پیچھے
اڑس کر وہ اس کے مقابل آئیں۔

”ان ہی کو فون کر رہی ہوں۔ تاکہ آپ خود بات کر کے مطمئن ہو جائیں۔“ فون آف تھا۔ اس نے پھر ملایا۔
لیکن بے سود۔

”ہج۔ ابھی فون آف جا رہا ہے۔“ اس نے ناامیدی سے کال کاٹ دی۔

”ہج بتا مجھے ماہا! پھر کوئی بات ہوئی ہے تمہارے درمیان۔“

”ارے۔۔۔ نہیں امی۔۔۔ بس وہ مجھے نہیں لے جاسکتے تھے۔ ان کے فلیٹ میں ایک جھوٹیلی۔“ اس نے
تھوک نکل کر خشک لبوں پر زبان پھیری۔

”کسی دوست کی فیملی آکر رہی ہوئی ہے۔ اس لیے۔“

”یہ کیا بات ہوئی؟“ کتنا مشکل تھا انہیں مطمئن کرنا اور اس سے بھی زیادہ مشکل تھا۔ خود کو مطمئن رکھنا اور
سنبھالنا۔

”وہ۔۔۔ لوگ یہ سمجھے کہ۔۔۔ حسیب یہاں آئے ہیں زیادہ دن کے لیے۔ اس لیے وہ ان کے فلیٹ پر آگئے۔ اب
انہیں کیا پتا تھا کہ وہ اتنی جلدی واپس جائیں گے۔“

”تو حسیب کیوں چلا گیا۔ وہ بھی رک جاتا۔“

”وہ کیسے رکتے۔ وہاں ان کا کام کا حرج ہو رہا تھا۔“ اس نے بیگ سے ایک لپ گلوزاٹھا کر مٹھی میں بھینچا۔

”تو اب وہاں کہاں رہے گا وہ۔“

یا اللہ اس نے گود میں رکھا بیگ پٹختے کے سے انداز میں نیچے رکھا۔

”اوہو امی۔“ وہ اٹھ کر ڈریسنگ تنگ گئی۔ اور ہاتھ میں پکڑا گلوزاٹھا خواہ ہونٹوں پر پھیرنے لگی۔ انداز میں اس
قدر محویت بھی جیسے اس سے زیادہ ضروری کوئی کام دنیا میں نہیں رہا۔

بہندہ کرن 217 جولائی 2015

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بُک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بُک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بُک کا پرنٹ پریویو
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

”آپ کیوں پریشان ہو رہی ہیں۔ حسیب اور ان کے فریڈز جن کی شادی نہیں ہوئی ہے۔ ان کے لیے یہ روٹین کی بات ہے۔“

”لیکن حسیب تو نہیں ہے نا اب کنوارا۔“ اس نے آئینہ دیکھتے ہوئے ایک کرب محسوس کیا۔ اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

”وہ کبھی بھی کنوارے نہیں تھے امی۔ کیا بتاؤں میں آپ کو۔“ دل کی بات دل میں ہی رہی۔

”اچھا نا سنا کیا ہے تم نے یا لے کر آؤں۔“

”وہ سمجھیں شاید ان کے تابوتوں سوالوں سے ماہا عاجز آ رہی ہے۔“

”نہیں بس چائے میں خود بنا لوں گی۔“ وہ تیزی سے بول کر کمرے سے نکل کر کچن میں چلی گئی۔

”میں ذرا دیر کے لیے نیچے جا رہی ہوں۔“

ای بولتی ہوئی کچن کے سامنے سے گزر کر میز صوفیوں کی طرف گئیں۔ ان کے قدموں کی چاپ ہلکی ہوتے ہوتے معدوم ہو گئی۔

ماہانے اپنے لبوں کو ہاتھ سے دبا کر بے ساختہ ابھرتی سسکی کو روکا۔ لیکن آنسوؤں کو نہ روک سکی۔ اسی طرح منہ پر ہاتھ رکھ کر دو قدم پیچھے ہو کر دیوار سے ٹکی اور پھر نیچے بیٹھتی چلی گئی۔

انسان کبھی کبھی کتابے اختیار اور بے بس ہو جاتا ہے۔ پوری جان لگا کر بھی لبوں پر مسکراہٹ نہیں لاپا تا اور پورا نور لگا کر بھی اس نمکین ہانی کو نہیں پیپا تا جسے اشک کہتے ہیں۔

انہوں نے زندگی میں پہلی بار کوئی اتنا خوفناک حادثہ حقیقی آنکھ سے اور اس قدر نزدیک سے دیکھا تھا۔

بس چند قدموں کا فاصلہ ہی تو تھا۔ یا چند سو قدموں کا۔ ان کے قدم بے اختیار بریک پر جا پڑے تھے۔ فائرنگ کی آواز اتنی ہی بلند واضح اور دہشت ناک تھی اور پھر۔

لو۔ بے حد بے حساب اور بے انتہا ہوتا ہوا لو تھا یا لہو لہان ہوش و حواس سے بیگانہ وہ انسانی وجود جو زندگی اور موت کے کھیل میں اپنی جان کی بازی بس ہارنے ہی والے تھے۔ سے کا جواری چال چل چکا تھا۔ اور مہرے بس پٹختی والے تھے۔

ان دونوں کے قریب سب سے پہلے پہنچنے والے بھی وہ خود ہی تھے اور ہوش و حواس قائم رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے ان کی آخری سانسیں بچانے کی کوشش کرنے والی بھی پہلے شخص وہ خود ہی تھے۔

اس سے پہلے بھی ان کا دل اس رفتار سے نہیں بھاگا تھا۔ یوں لگتا تھا وہاں کھڑے کھڑے وہ یا تو دل کے مریض بن جائیں گے یا اعصابی شکست خوردگی کے۔ اس پاس رش بڑھ رہا تھا۔ لوگ جمع ہو رہے تھے۔ لیکن وہ صرف تماش بین تھے۔ جو تماش ختم ہونے کے انتظار میں تھے۔ اس تماشے کو جاری و ساری رکھنے کی ساری جدوجہد وہ خود ہی تنہا کرنے والے تھے۔

ٹیکسی کے کھلے دروازے سے انسانی دھڑ، کسی بے جان پوری کی طرح آدھے باہر لٹک رہے تھے۔ خاک، خون اور کالج کی کرسیوں پر کھڑے ہو کر انہیں سیدھا کرتے، کٹی اور ہاتھ مدد کے لیے آگے بڑھے۔ ایک عجیب سی وحشت کے عالم میں ساتھ چھوڑتے حوصلے کو ذرا کی ذرا سہارا ملا۔ گاڑھا اور سرخ خون اب ٹیکسی سے نکل کر اطراف میں پھیلنا جا رہا تھا۔

ایمبولینس کل کرتے، انہیں اچھی طرح محسوس ہو رہا تھا کہ ان کے مضبوط ہاتھوں میں واضح لرزش اتر آئی

تھی۔ ان کے ہاتھ کپڑے اور چہرہ بھی لمبوں میں لٹھڑچکا تھا۔

میڈیٹ میڈھے گوشت پوست سے بنے بھاری بھرکم نیم مرہ تنوں کو کھینچ کر زمین پر لٹاتے سے، کچھ جی داروں نے تو ان میں سے ایک کی موت کی تصدیق تک کر دی تھی۔ لیکن وہ خود کسی بات پر یقین کرنے سے پہلے، ایک آخری کوشش کر لینا چاہتے تھے۔

جب ہی گہری گہری سانسیں لیتے کلام الہی کے جو کچھ حصے انہیں یاد تھے۔ اس وقت تک دم کر کے ان پر پھونکتے رہے۔ جب تک ایمبولینس کے سائرن کی گونج نے پوری فضا میں شور برپا نہ کر دیا۔

کچھ دیر کے بعد انس کو حیدر آباد کے لیے لکھنا تھا۔

سو یا اس کے ہینڈ کیری میں انتہائی ضروری سامان رکھ رہی تھی۔ اس کے ہاتھوں کی رفتار معمول سے کہیں ست تھی اور لگتا تھا دل بھی معمول سے ہلکی رفتار میں دھڑک رہا ہے۔

”کیا ہوا کن سوچوں میں کم ہو۔“

انس مسلسل دوستوں سے فون پر رابطے میں لگا تھا۔ پھر بھی اس نے اس کی خاموشی اور اداسی کو محسوس کر لیا تھا۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس کا اپنا دل میں اتنے دن بعد سویا سے ملنے پر جدائی کے لیے تیار نہ تھا۔ اس کا موڈ کچھ اس سے دور جانے کی وجہ سے اور کچھ نوکری کی ٹینشن سے بجھا بجھا سا تھا۔

”کچھ نہیں بس۔ آپ کے جانے کا سوچ کر مجھے الجھن سی ہو رہی ہے۔“

”الجھن یا اداسی۔“

”اداسی بھی ہے اور الجھن بھی۔“ اس نے ہینڈ کیری کی زپ بند کی اور وہیں بیڈ پر بیٹھ گئی۔

”کہنے کو میرے سسرال میں ساس سسر اور نندوں کے نام پر کوئی جھگڑا نہیں۔ لیکن بس پھر بھی پتا نہیں کیوں مجھے یہاں آپ کے بغیر رہنے کے خیال سے ہی ٹھن سی ہو رہی ہے۔“

”جج۔ اتنا ذہن پر سوار مت کرو نا!“ انس نے ہاتھ سے اسے نزدیک آنے کا اشارہ کیا۔ وہ وہاں سے اٹھ کر اس کے برابر ہی آکر بیٹھی تو اس نے اسے بازو کے گھیرے میں لے لیا۔

”جیسے ہی انتظام ہو گا۔ میں تمہیں بلوالوں گا۔“

سہانے جیسے اس کی بات سنی ہی نہیں۔ اس نے اس کے کندھے پر سر ٹکا کر اپنے بائیں ہاتھ میں اس کے دائیں ہاتھ کی انگلیاں پھنسا لیں۔

”وہ تو جب آپ بلائیں گے تب نا! ابھی تو یہاں بس میں ہوں گی یا یہ۔“ نائلہ۔“

”انس تو انس۔ اسے خود محسوس ہوا کہ نائلہ کے نام پر اس کے حلق میں ایک کڑواہٹ سی کھل گئی۔

”اس نے کیا کہا ہے تمہیں۔“

”کیا کہنا ہے اس نے۔ کچھ بھی نہیں بس۔“ اس نے ایک گہری سانس لے کر بات ادھوری چھوڑ دی۔

کچھ باتیں ادھوری رہ کر بھی پورے معنی سمجھا دیتی ہیں۔ پھر ان کا کہنا نا کہنا برابر ہو جاتا ہے۔ اگر وہ کوئی رخ بات ہو تو اس کی منحنی بھی پوری طرح محسوس ہوتی ہے۔ اور اگر وہ کوئی ممکنے لفظ ہوں تو ان کی خوشبو سے پورا امن پورا وجود مہک جاتا ہے۔

”فکر مت کرو تم۔ میں روز فون کروں گا اور زیادہ عرصہ تمہیں رونا نہیں پڑے گا یہاں اور اگر کوئی بات ہو بھی۔ کوئی مسئلہ ہو تو حدید سے کہنا۔“ وہ بات کرتے کرتے رکاوٹ سے اسے کچھ یاد آیا۔

”کمال ہے۔ کل سے میں نے حدید کو نہیں دیکھا۔“ اس کے لہجے میں تعجب تھا۔

”جی! رات بھی وہ ستویر سے گھر آئے تھے۔“
”چلو! ٹائم کم ہے۔ میں اسے فون کر لوں۔ تم ایک نظر اور دیکھ لو کچھ رہ تو نہیں گیا۔“ اس نے بولتے ہوئے سہوا کو اپنے بازو کے گھیرے سے آزاد کیا اور فون پر حدید کا نمبر لپٹا۔ تیل جاتی رہی مگر فون ریسپونڈ نہیں ہوا۔
کئی بار کی کوششوں کے بعد وہ یکدم چونک گیا۔ فون آف کر دیا گیا تھا۔

”کام میں کسی صورت اس کا دھیان نہیں لگ رہا تھا۔ آج دو دن بعد بھی اس کے غصے کی آگ یوں ہی بھڑک رہی تھی۔

نالکہ کی شکل سامنے آتے ہی اس کے جسم و جاں کو جھلسانے لگتی۔ اسے لگتا کہ یا تو وہ خود مر جائے گا یا پھر اسے مار ڈالے گا۔ لیکن اس سے اپنی عزت، نفس پر پیر رکھ کر یہ نہیں پوچھ سکے گا کہ آخر اس میں کیا ہے۔ کیوں وہ اس کے نزدیک اتنا پسند نہیں کرتی۔

کوئی مرد اتنا مضبوط نہیں ہوتا۔ کسی میں اتنی طاقت نہیں ہوتی کہ عورت ذات کے گنجلک کھولنے کے لیے اپنی عزت، نفس کی بھیجٹ چڑھا سکے۔ عورت بھی وہ جو کبھی اسے دل کو نہیں بھائی۔ اس کی نظموں میں نہیں سائی اور بیوی کے منصب پر کبھی فائز ہونے کے لیے کوئی خوب صورت کوشش تک نہیں کر پائی۔

وہ جب سوچتا۔ اس کی رگوں میں شرارے سے ناچ اٹھتے۔ دو دنوں میں اس نے صرف رات کے چند گھنٹے گھر میں بتائے تھے۔ وہ بھی اس طرح جیسے بستر پر اس کے برابر میں کوئی عورت یا اس کی بیوی نہیں۔ انسانی روپ میں کوئی اچھا دھاری ناگن لٹی ہے۔ ذرا جو اس نے گردن گھمائی یا کروش بدلتے کی کوشش کی تو ناگن اس کے وجود سے لپٹ کر اسے خاکستر کر ڈالے گی۔

یہ دو دن اس نے جس طرح خاموشی سے گزارے تھے۔ صرف اس لیے کہ وہ شاید نالکہ کا خون اپنی گردن پر نہیں لینا چاہتا تھا۔ ورنہ غصے کی شدت تو اتنی تھی کہ جی چاہتا کہ پہلی فرصت میں اس کا گلادیا کر قصہ ختم کرے۔
دو دن کے ضبط اور برداشت کا سبب بھی شاید صرف اتنا ہی تھا کہ جلدی تھوڑا نیچے اتر آئے۔ یہ اس کی شرافت اور انسانیت تھی کہ اتنے شدید غصے کے باوجود وہ نالکہ سے ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ بات کرنا چاہتا تھا۔

وہ نالکہ کے دل کی بات جانا چاہتا تھا۔ وہ اس رشتے کو بنانے کے لیے یقیناً خود حدید کی طرح ہی دل سے رضا مند نہیں تھی۔ لیکن اب وہ اس رشتے کو نبھانے کے لیے بھی رضامند تھی یا نہیں۔ اس کے دل میں کیا تھا۔ اس کے دماغ میں کیا چل رہا تھا۔ اس کے ارادے جاننے کے لیے خود پر قابو پانا ضروری تھا اور وہ کس جدوجہد سے خود پر قابو پانے جیسی آزمائش سے گزر رہا تھا یہ وہ خود ہی جانتا تھا۔

آفس سے چھٹی لینا بھی بے کار تھا۔ اس کے اور انس کے دوست مشترکہ تھے اور معاملہ ایسا تھا کہ کسی سے بانٹا بھی نہیں جاسکتا تھا۔ بے حد کوششوں کے بعد اس نے حاضر دماغی سے آفس میں اپنا دھیان لگانا شروع کیا تھا۔ یوں بھی یہ جگہ ایسی تھی جہاں جتن نہ ہونے کے برابر اور دشمن جگہ جگہ بکھرے پڑے تھے۔ گھاگ اتنے کہ اڑتی چڑیا کے پر گن لیں اور بتاؤں اتنے کہ ان سے بڑھ کر کوئی ہمدرد نہیں۔

حدید نے اپنا کردار ہمیشہ بہت صاف ستھرا اور غیر جانبدار ہی رکھا تھا۔ اب اس ناپسندیدہ عورت کے لیے وہ خود پر کوئی دماغ دھبا برداشت کرنے کا اہل نہیں ہو سکتا تھا۔

ایک گہرا سانس لے کر اس نے کمپیوٹر اسکرین پر سے نظریں ہٹائیں اور ذرا سختی سے بند کر کے کھولیں۔

مسلل روشنی پھینکتے اسکرین پر نظریں گاڑنے سے آنکھوں میں ترمیر سے تانے لگے تھے۔
ذہنی رو بھٹکتی ہوئی آکر واپس اپنی جگہ ٹھہری تو دیر سے وائبریشن پر لگے سیل فون کی تھر تھراہٹ نے توجہ کھینچ لی۔

وہ چونکا ضرور۔ لیکن فون ریسپونڈ نہیں کر سکا۔ ایسا بھی پہلی بار ہی ہوا تھا کہ ایک شہر اور ایک گھر میں ہوتے ہوئے اس کا اور انس کا مسلسل دو دن سے سامنا نہیں ہوا تھا۔ پھر بھی وہ خود کو بھی اس قابل نہیں پارہا تھا کہ بشاش لہجے اور آواز میں انس سے بات کر سکتا۔ انس یقیناً ”ٹھٹھک جاتا۔ اس کی نوکری جا چکی تھی۔ وہ پہلے ہی پریشان تھا۔ اور آج ہی حدید آباد کے لیے نکل رہا تھا۔ اسے فیصلہ کرنے میں چند لمحے ہی لگے ہوں گے۔“
”بعد میں خود فون کر کے تسلی سے تفصیل سے بات کر لوں گا۔“

دل ہی دل میں بول کر اس نے پہلے لائن کالی پھر فون ہی آف کر دیا۔ یہ سوچے بغیر کہ انس کو تشویش میں ڈالنے کے لیے یہ حرکت بھی کافی تھی۔

”پرائیویٹ نوکری کرتا ہے لڑکا۔“

اماں فون پر نالکہ سے بات کر رہی تھیں۔ قریب ہی عفت سپاٹ چہرے کر بیٹھی۔ ابا کے سر میں تیل کی مالش کر رہی تھی۔ ابا بہت عرصے بعد اس طرح فرمائش کر کے عفت سے مالش کروانے بیٹھے تھے۔ جیسی اماں ان دونوں کو ساتھ دیکھ کر وہیں بیٹھ کر نالکہ کو فون کر بیٹھیں۔ خود نالکہ کو تو اماں کو فون کرنے یا گھر آنے کا خیال ہی نہیں تھا۔ اماں ہی بے چاری اس کی فکر کرتی تھیں۔ یا بھی کبھار ابایا دکر لیتے تھے۔

”تعلیم بھی اچھی ہے۔ چودہ جماعتیں۔ ہاں ہاں وہی گرے جیٹ (گریجویٹ) ہے۔“

اماں بے حد شوق سے نالکہ سے ذکر کر رہی تھیں۔ پتا نہیں نالکہ کے تاثرات کیسے تھے۔ کیا وہ خوش ہوگی۔ یا افسردہ۔ لیکن افسردہ کیوں ہوگی۔ ہاں ہو بھی سکتی ہے۔ عفت کی ذہنی رو اس کی انگلیوں کی طرح ہی یکھڑکھڑا رہی تھی۔

ایک سچائی جس سے وہ دونوں بہنیں یا شاید وہ تینوں وہ نالکہ اور حدید بھی واقف تھے۔ کسی پیپ زدہ پھوڑے کی مانند ان کے درمیان آگ آئی تھی۔ جس سے کراہیت بھی آتی تھی۔ لیکن علاج کے لیے اس کی طرف دیکھنا بھی ضروری تھا۔ حدید اور اس کے ایک دوسرے کی طرف جھکاؤ سے ان دونوں کے علاوہ نالکہ بھی واقف ہی تھی۔

اب اس کی شادی کی بات اس کے لیے باعث خوشی ہی ہوگی۔ اگر اس نے دل سے حدید کو اپنا لیا تھا اور ایک وفا شعار بیوی کی طرح حدید کے دل میں گھر کرنے کی کوشش کر رہی تھی تو عفت کی شادی پر خوشی محسوس کرنا بھی اسی کا ایک حصہ ہو سکتا تھا۔ کیونکہ اسے عفت سے نا محسوس سا خوف تو بہر الحال محسوس ہوتا ہی ہو گا۔ یہ بھی اس کی وفا شعار ہی ہوتی کہ شوہر سے ماضی میں دلچسپی رکھنے والی لڑکی اور وہ بھی سگی بہن کو ٹھکانے لگانے کی کوشش کرنا اور کامیاب ہونے پر خوش ہونا۔

”ہیں۔ کیا گمہ رہی ہو۔“

اماں جملہ تفصیلات بمعہ اس کی پہلی شادی اور ایک بچے کے نالکہ کے گوش گزار کر چکی تھیں۔

”اے لومہ۔ یہ کیا۔“

انہوں نے فون کانوں سے ہٹا کر اچنبھے سے فون کو اور پھر ابا کو دیکھا۔

”آدمی پونی بات سن کر کچھ بھی کہے بغیر فون بند کر دیا۔“

ماہنامہ کرن 221 جولائی 2015

ماہنامہ کرن 220 جولائی 2015

”چلو کسی کام میں مصروف ہوگی۔“

”ارے ایسی بھی کیا مصروفیت۔ اس سے بات نہیں کروں گی تو اور کس سے کروں گی۔ خیر۔۔۔“ انہوں نے بات ادھوری چھوڑ کر مسری سے پرچے لٹکائے۔
”یہ بھی اچھا ہی ہوا ورنہ میں تو سمجھ رہی تھی کہ وہاں جو کاسن کر جانے کتنا غصہ کرے گی۔“ اماں بات مکمل کر کے باہر چل دیں۔ جبکہ اماں کی بات سن کر ابا کے سر میں تیزی سے چلتی اس کی انگلیوں کی رفتار دھیمی پڑ گئی تھی۔

وہ بے حسی سے موبائل فون کی ٹیبلٹ سن رہی تھی۔
ایک کچھ دیر کے لیے نیچے گئی تھیں تاہی امی کے پاس۔ عفت کے رشتے کے لیے کچھ لوگ آنے والے تھے سنا تھا۔ اچھا گھر نہ اور معقول رشتہ تھا لیکن لڑکے کی ایک شادی پہلے بھی ہو چکی تھی۔

”بے چاری عفت۔۔۔ پتا نہیں کیسے۔“

”اماں! امی کی آواز سے اس کی سوچیں ادھوری رہ گئیں۔“

”کب سے فون بج رہا ہے۔ میں بیڑھیوں سے آواز سنی ہوئی آئی ہوں۔“

”جی۔“ وہ بے طرح جو ٹی اور اپنی غیر حاضر ماضی کی گہرائی پر خود بھی دم بخود رہ گئی۔

”امی وہ کوئی رانگ نمبر ہے بار بار تنگ کر رہا ہے۔“ اس نے فون ہاتھ میں لے کر اپنی بات کی سچائی ثابت کرنے کے لیے زور سے بٹن دبا کر لائن کاٹ دی۔

”آپ بتائیں ہو گئی بات تاہی امی سے کیا کہا انہوں نے۔“

”کیا کہیں گی وہ بے چاری۔“

اماں کی بات پر ان کا دھیان فی الفور فون سے ہٹ عفت کے لیے آنے والے رشتے کی طرف چلا گیا۔ وہ تھکی ہوئی نہیں تھیں۔ لیکن ان کے لہجے اور انداز میں بے نام سی جھکن اتر آئی۔

”بظاہر تو کوئی خرابی نہیں لگ رہی اب یہ تو گھر والوں سے مل کر پتا چلے گا کہ فیملی کیسی ہے۔“

”میسو والے ہیں۔“ وہ بغور امی کا مایوس لہجہ سن رہی تھی۔

”بتا تو رہی تھی رشتہ والی۔“

”بس تو اگر میسو والے ہیں تو سمجھ لیں کہ آدمی برائیاں تو یوں ہی چھپ جائیں گی۔“

”ہاں بھیا آج کل کا چلن بھی خوب ہے۔ چوڑے چہرے بھی خاندانی بنے بیٹھے ہیں۔ دولت کے بل بوتے پر۔“

اور جو خاندانی اور شریف لوگ ہیں۔ ان بے چاروں کو غرور کی وجہ سے کوئی پوچھتا نہیں۔“

امی نے پیر اوپر کیے اور دیوار سے ٹکا کر رکھے تکیے کو سیدھا کر کے لیٹ گئیں۔ اماں چند لمحے کسی سوچ میں ڈوبی رہی۔ پھر چونک کر انہیں دیکھا۔

”عفت سے بات کی آپ نے کیا کہتی ہے وہ۔“

”وہ کیا کہے گی۔ جو اماں باپ کی مرضی ہوگی۔ اس پر سر جھکا دے گی۔“

”اللہ کرے لڑکا بہت ہی اچھا ہو۔“ اماں کے دل سے بے ساختہ ایک دعا نکلی اور لبوں تک آپہنچی۔

”آمین۔ اللہ کرے ہر لحاظ سے ہی اچھا ہو مگر۔ خالی لڑکے سے کیا ہوتا ہے۔ جب لڑکی بھرے پرے گھر میں جاتی ہے تو سب سے ہی سابقہ پڑتا ہے۔ اللہ بچی کے نصیب اچھے کرے۔“ اماں امی کے چہرہ دیکھتی ”ان کی بات سن کر کھو گئی۔“

جانے کتنی دیر خاموشی چھائی رہی۔ اماں کی نگاہیں۔ امی کے چہرے سے ہٹ کر سماں وہاں بھٹکنے لگیں۔ انداز سے صاف ظاہر تھا کہ ذہن اور نظموں میں کوئی مطابقت نہیں۔ آنکھیں دیکھ کچھ اور رہی تھیں۔ اور ذہن سوچ کچھ اور رہا تھا۔ (میں تو بھرے پرے خاندان میں نہیں گئی تھی۔ لیکن۔) ادھر ادھر سے ہوتی ہوئی اس کی نگاہیں پھر امی کے چہرے پر آن پکی۔

”کتنی کمزور ہو گئیں ہیں امی! بے چاری۔ سارا دن اسکی ہی گھر کے کاموں میں لگی رہتی ہیں۔ اوپر سے میں یہاں ہوں تو۔۔۔“ اس کی سوچوں کو بریک لگا۔ فون کی گھنٹی ایک بار پھر بجنے لگی تھی۔ اس نے جلدی سے امی کی نیند ٹوٹنے کے خوف سے ریسیو کر لیا۔ دوسری طرف آپنی تھیں۔ اس نے سلام کیا۔

”کیا حال ہیں سب خیریت ہے۔“ وہ جواب دے کر پوچھنے لگیں۔

اماں کو ان کا لہجہ کچھ غیر معمولی سا لگا۔ پہلا خیال یہی آیا کہ شاید حبیب نے اس کی شکایت لگائی ہے۔ دل میں ایک دم ہی بے زاری ابھرنے لگی۔

”جی سب خیریت ہے۔ اللہ کا شکر۔“

”اچھا۔ وہ میں حبیب کا فون ملا رہی ہوں۔ کافی دیر سے مگر آف جا رہا ہے۔“

”اچھا۔“ اسے ایک دم ہی یاد آیا کہ اس نے گھر آتے ہی حبیب کا فون ملایا تھا تو وہ تب بھی آف تھا۔

”ہاں تم سے کانٹیکٹ ہو تو پتا کرنا۔“

”اوکے۔“

وہ شاید جلدی میں تھیں۔ زیادہ لمبی بات نہیں کی۔ اماں نے فون بند کر کے امی کو دیکھا۔ ان کا تنفس ہموار تھا۔ اور وہ نیند میں جا چکی تھیں۔

”خیریت تو ہے۔ آج امی اس وقت سو گئیں۔“

اجالے کو اپنی آغوش میں سمیٹتے اندھیرے اور اذانوں کی آوازوں پہ اس نے کھڑکی سے باہر نگاہ دوڑا کر جو آخری بات سوچی وہ یہی تھی۔

آپریشن تھیکری سرخ بتی گھنٹوں سے چل رہی تھی۔ اندر موجود شخص جو کوئی بھی تھا۔ اس وقت تو انہیں انتہائی عزیز ہو چلا تھا۔ کیونکہ ہاسپٹل پہنچتے ہی ڈاکٹر نے فی الفور آپریٹ کرنے سے انکار کر دیا تھا کیونکہ کیس پولیس کا تھا۔ اور جتنی دیر میں پولیس پہنچی۔ وہ بے چارے مسلسل دہی آواز اور مضطرب لہجے میں ڈاکٹر کی منتیں ہی کرتے رہے۔ مریض کی حالت بے شک نازک تھی۔ اور پولیس کے آتے آتے اور نازک ترین ہو چکی تھی۔ لیکن نہ پولیس کو اس کی حالت سے سروکار تھا۔ نہ ڈاکٹر کو کوئی جلدی تھی۔ ہاں اگر کوئی احساس کرنے والا تھا تو وہ وہ خود ہی تھے۔ خدا خدا کر کے پولیس آئی۔ رپورٹ درج کی گئی۔ خود ان کے گرد سوالات اور تفتیش کا دائرہ سب سے تنگ تھا۔ مگر وہ صبر سے برداشت کرتے رہے۔ تمام کارروائیوں سے نمٹنے کے بعد جب ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوا ہی چاہتا تھا۔ تب لب مرگ اس شخص کو آپریشن تھیکر میں لے جایا گیا۔ جبکہ اب ڈاکٹر اس کی زندگی کے بارے میں زیادہ ہر امید نہیں تھے۔ خون بہت زیادہ بہہ جانے کے سبب اس کی زندگی کے چانسز کم اور موت کے زیادہ تھے۔ ٹیکسی ڈرائیور جس کی موت کی تصدیق اسپتال لانے سے ہی پہلے لوگوں کے ذریعے کروی گئی تھی۔ اس کے لواحقین روتے پیتے آکر اس کی میت کو لے جا چکے تھے۔ اب وہاں رہ گئے تو وہ خود یا ان کا پی اے۔ جو کئی بار کالز کر کے ان سے بات کرنے میں ناکام ہو کر ان کی گاڑی میں لگے ٹریکر کے ذریعے ان تک پہنچنے میں کامیاب ہوا تھا۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بُک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرٹک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بُک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بُک کا پرنٹ پریویو
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

تب سے اب کئی گھنٹے گزر جانے کے باوجود وہ ان کے ساتھ ہی تھا۔ اور دل میں ہزار خواہشیں رکھنے کے باوجود ان سے گھر جانے کے لیے نہیں کہہ سکا تھا۔ خدا خدا کر کے آپریشن تمام ہوا۔ ڈاکٹرز نے باہر آکر لواحقین کو تلاش کیا۔ وہ بے تابی سے لپک کر گئے۔

”کیا ہوا ڈاکٹر صاحب۔ وہ بے چارہ بچہ تو گیا ناں۔ اب ٹھیک ہے۔ آپریشن کامیاب ہو گیا۔“ ان کے لبوں سے سوالات کے پیچھے بے تابی سے پھر پھڑپھڑاتے ہوئے نکلے۔ ڈاکٹر نے ایک گہری سانس بھری۔ ان کے پاس کوئی امید افزا خبر نہیں تھی۔ مغیث حسن نے بمشکل دیوار تھام کر خود کو لڑکھڑانے سے روکا تھا۔

انس کیا گیا تھا۔ درود یووار سے لے کر موسم چار دیواری اور اس کا اپنا جیتا جاگتا وجود سب ہی کچھ ایک بے نام سی اداسی کی لپیٹ میں آ گیا تھا۔ اس نے شاید زندگی میں اس سے پہلے کبھی اتنی اداسی محسوس نہیں کی تھی۔ یا شاید یہ انس کی اس محبت، بھری رفاقت کا اثر تھا۔ جو پچھلے چوبیس گھنٹوں میں اسے میسر رہی۔ دونوں دنیا جہان کی فکریں بھلا کر ایک دوسرے میں ہی گم رہے۔ یہاں تک کہ اس گھر میں موجود باقی دو نفوس کو بھی۔

اب جبکہ وہ چلا گیا تھا۔ اور سوہا کو علم تھا کہ شام تک انتظار کرنے کے بعد بھی یہ کمرہ اس کے وجود کی رونق سے کپکپ نہیں ہوگا۔ اسے یہ تمنا تھی اور خاموشی کاٹ کھانے کو دوڑ رہی تھی۔ کچھ خیال آنے پر اس نے ماہا کو کال کی۔ لیکن کافی دیر بلکہ بار بار تیل جانے پر بھی اس نے فون ریسیو نہیں کیا۔

وہ اس بات سے یکسر انجان تھی کہ ماہا آج صبح ہی صبح امی کے گھر واپس آچکی ہے۔ وہ یہ تصور کر رہی تھی کہ ماہا حبیب کے ساتھ ہے۔ اور اس قدر مگن ہے کہ خیال تک نہیں کہ اپنا سیل فون اٹھا کر دیکھ لے کہیں کسی کی کال تو نہیں آ رہی۔ یقیناً ”سائنٹسٹ“ پر رکھا ہوگا۔ جب ہی ریسیو نہیں کیا۔

اس نے از خود ہی ساری باتیں فرض کر لیں۔ جو کہ ظاہر ہے خوش خیال ہی تھیں۔ پھر بے زاری سے فون بچ دیا۔ انس سے بات ہو چکی تھی۔ اب بار بار فون کر کے اسے ڈسٹرب کرنا بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

”ماں نلکہ کو دیکھتی ہوں کیا کرتی رہی ہے سارا دن اکیلے۔ کچھ کام میں ہاتھ ہی بٹا دوں۔“

خود سے کہتے ہوئے اس نے کمرے سے باہر قدم نکالا اور سیڑھیاں اترنے لگی۔ عام حالات میں وہ اس طرح خود سے نالکہ کے پاس جانے کا تصور تک نہیں کر سکتی تھی۔ بلکہ شادی کے بعد سے وہ نالکہ کے مزاج سے ٹھیک ٹھاک خوف کھانے لگی تھی۔ نالکہ کا موڈ اگر خراب ہو تا تو وہ اس سے بد تمیزی کرنے میں اور اسے جھڑکنے میں دیر نہیں کرتی تھی۔ لیکن اب کی بات اور تھی۔

کل جس طرح وہ اس کے گلے لگ کر روئی تھی۔ اور جس طرح اس نے اپنی تمنائی کا شکوہ کیا تھا۔ اس سے سوہا کے دل میں نہ صرف خود بخود گنجائش پیدا ہو گئی تھی بلکہ دل میں اس کے خلاف موجود بہت سارے گلے شکوے اپنی موت آپ مر گئے تھے۔

آخری میٹر می سے نیچے والے فلور پر قدم رکھتے ہی اسے یوں محسوس ہوا جیسے گھر میں خود اس کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے۔ نیچے پورا گھر اس قدر خالی اور خاموش پڑا تھا جیسے یہاں کسی زندگی کے آثار ہی نہیں۔ لمحے بھر کو اسے خوف سا محسوس ہوا۔ پھر اپنے نپاگل پن پر یہ خود کو اس نے جھڑک دیا۔

”واش روم میں یا اپنے بیڈ روم میں ہوگی نالکہ جائے گی کہاں۔“

کچن بالکل خالی اور صاف ستھرا تھا۔ یقیناً ”وہاں بھی کافی دیر سے قدم نہیں رکھا گیا تھا۔ سامنے ہی لاؤنج تھا۔ خالی لیکن صاف ستھرا۔ سجا ہوا۔ دائیں طرف حید کے بیڈ روم کے دروازہ نہموا تھا۔ اس نے دھیرے سے آواز دی

لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔ اس نے قریب جا کر دروازے کو ہلکے سے دھکیلا۔

نالکہ سامنے ہی کھڑی تھی۔ لیکن دروازے کی طرف پشت کر کے سوہانے بے اختیار ایک گہری اطمینان بھری سانس لی۔ دل میں جو ایک عجیب سی بے چینی لاحق تھی اس کا خاتمہ ہوا تھا۔

”نالکہ! اب کی بار اس نے ذرا زور سے پکارا۔ نالکہ بری طرح چونک کر ہلکے کسی حد تک خوف زدہ ہو کر پلٹی۔ اس کے اس طرح ڈر جانے پر سوہا یقیناً ”حیران“ ہوئی لیکن اسے حیران ہونے کی مہلت نہیں ملی۔ وجہ تھی نالکہ کی دیگر گوں حالت۔ اس کے ہاتھ میں موبائل تھا۔ اور آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔ بال اجڑے بکھرے اور کپڑے بے حد گندے ملے ہوئے تھے۔

نالکہ کیا ہوا۔ کس سے بات کر رہی تھیں۔ تمہاری طبیعت ٹھیک ہے۔“ سوہا خود بھی گھبرا گئی۔ نالکہ جواب دینے کے بجائے عجیب خالی خالی سپاٹ نظروں سے اسے دیکھتی رہی۔ سوہا کو وہ اس لمحے بالکل کوئی مجھول۔ سودا سن لگی۔ خط الحواس۔

”ایسے کیا دیکھ رہی ہو مجھے۔ نالکہ۔“ وہ آگے بڑھ کر نالکہ کے کندھے پر ہاتھ رکھنا چاہتی تھی۔ لیکن اس کے رد عمل نے باز ہی رکھا۔

”ہیں؟“ ”وہ جیسے گہری نیند سے جاگی۔“ ”نہیں بس۔ کچھ نہیں۔“ اس نے جلدی جلدی آنکھیں رگڑیں۔ اور پلٹ کر موبائل کو ہاتھ اونچا کر کے الماری کے اوپر رکھ دیا۔ سوہانے بطور خاص اس کا یہ عمل نوٹ کیا۔ موبائل کو بھلا خود سے اتنا دور رکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ جیسے بچوں کی پہنچ سے دور رکھ رہی ہو۔

”تم رو رہی تھیں۔ لیکن کیوں۔“

اسے اندازہ ہو گیا تھا نالکہ اس کی طرف دیکھنے سے گریزاں تھی۔ وہ خود ابھی تک دروازے سے ایک قدم اندر کھڑی تھی۔ نالکہ نے اسے بیٹھنے تک کے لیے نہیں کہا تھا۔ نہ اس کی بات کا جواب دیا تھا۔ دوسری طرف نالکہ کو اس کے اس قدر اچانک آجانے کی رتی برابر امید نہیں تھی۔ جب ہی وہ فوراً ”خود کو سنبھال بھی نہیں سکی اور گڑبڑا گئی۔ مزید کمر سوہا کے سوالات نے پوری کر دی۔

”کیا حید بھائی سے کوئی ناراضی ہے۔“

اس نے خود ہی اندازہ لگایا کہ شاید نالکہ اپنی اور حید کے ذاتی مسئلے کو ڈسکس نہیں کرنا چاہتی۔ اور اس کے اندازے نے نالکہ کی مشکل آسان کر دی۔ اس نے خود کو سنبھالا اور بڑے ڈرامائی انداز میں اس کی طرف مڑی۔

”ظاہر ہے اور کیا بات ہو سکتی ہے۔“

”اچھا۔ لیکن کیوں کس بات پر۔ وہ تو بہت کول مائنڈ ڈ ہیں۔“

”یہی تو میری بھی سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیوں۔ بس رات کو دیر سے گھر آنا اور تلخ باتیں کرنا۔ طرز کرنا۔ مجھے نظر انداز کرنا۔ کوئی ایک بات ہو تو بتاؤں تمہیں۔“

وہ بے بسی سے انگلیاں مروڑنے لگی۔ آنکھیں پھر بھر آئیں۔ سوہا بے اختیار اس کے قریب آئی۔

”اچھا تم رو تو مت۔ اگر تم کہو تو۔ میں بات کروں ان سے۔“

”نہیں نہیں بالکل نہیں۔“ سوہا کو اسی جواب کی امید تھی۔

”ایسا نہ ہو وہ تم پھر بھی بھڑک جائیں۔ اور مجھ سے اور زیادہ ناراض ہو جائیں۔“

”اوکے۔“ سوہا اس کے گھبرانے پر اسے تسلی دینے والے انداز میں ساتھ لگا کر بیڈ تک لے گئی۔ پھر اسے بٹھا کر اس کے برابر بیٹھ گئی۔

”میں نہیں کروں گی ان سے بات۔ لیکن ایسے کیسے پتا چلے گا پھر کہ مسئلہ کیا ہے۔“
 ”شاید آفس کی کوئی پرانی بات۔“ نائلہ نے آنکھیں پونچھتے ہوئے اندازہ لگایا۔
 ”ہاں یہی بات ہوگی۔ یاد نہیں۔ جب انس کے آفس میں پرانے ہو گئی تھی۔ تو وہ کسی طرح چنچڑے ہو گئے تھے۔“
 ”سہانے بے ساختہ ہی انس کا حوالہ دیا تھا۔ اور نائلہ کے دل میں کسی نے چٹکی کاٹ لی۔“
 ”خیر جو بھی مسئلہ ہو اس میں خود ہی سولو کر لوں گی۔ تم پریشان مت ہونا۔“
 اس کا لہجہ اتنا اچانک بدلہ اور اتنا روکھا ہو گیا کہ سہا دنگ رہ گئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اگلی بات کیا

”اور اگر اب تم نیچے آئی گئی ہو تو پلیز رات کا کھانا دیکھ لو۔ میں نے دن بھر بہت کام کیا ہے۔ میں ذرا آرام کروں گی۔“
 سہا کے دل میں اس کے لیے ہمدردی بھرے چند جذبات جو کچھ منٹ پہلے کی پیداوار تھے۔ یکایک ہی فضا میں اڑ چھو ہو گئے۔
 اس کے دونوں بازو ڈھیلے ہو کر لٹک سے گئے۔ کھانا بنانا اور وہ بھی صرف تین لوگوں کا کوئی اتنا بڑا کام نہیں تھا۔ لیکن نائلہ نے ہمیشہ کی طرح اسے پل میں پرانے کر دیا تھا شاید اس کی اوقات یاد دلا دی تھی۔
 وہ مڑ کر تیزی سے باہر نکل گئی۔ مزید وہاں رکنا یا کچھ اور کہنا اپنی بے عزتی کے مترادف ہی ہوتا۔ اسے جاتا دیکھ کر نائلہ اپنی جگہ سے اٹھی۔ اور الماری پر رکھا ہوا سویا کل اٹھایا۔ اس کی آنکھیں ایک بار پھر پھرنے لگی تھیں۔
 وہ تیزی سے کال لاگ میں سے ہسٹری ڈیلیٹ کر رہی تھی۔ اس کے بعد مسجوزان باکس کی باری تھی۔ جتنی تیزی سے اس کی انگلیاں چل رہی تھیں۔ اس سے زیادہ تیزی سے اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے تھے۔ اس کے پاس بھیجتے چہرے کو صاف کرنے کی فرصت تھی نہ خواہش۔
 ”طبیعت نہیں۔ میری قسمت خراب ہے۔“ وہ دل ہی دل میں خود سے مخاطب تھی۔

رات کے ڈھائی بجے کا وقت تھا۔ گہری رات کا مخصوص سناٹا اپنی کالی چادر کھول کر زمین آسمان کو سمیٹ چکا تھا۔ آسمان پر تاروں کی مہک بے حد مدھم تھی۔ دور کہیں سے کبھی کبھی جو کیدار کے سیٹی بجانے کی تیز آواز پر وہ سماعت پر گرتی تو بند کمرے میں سانس لیتے بظاہر سوتے لیکن درحقیقت جاگتے وجود اپنے آپ میں چونک جاتے۔
 وہ جانتی تھی وہ جاگ رہا ہے، لیکن ظاہر نہیں کر رہا۔ لیکن وہ خود ظاہر کر رہی تھی۔ اپنے جاگتے حواس بھی۔ اور اپنا اضطراب بھی۔

بار بار کروٹ بدلتے ہوئے وہ ذرا فاصلے پر لیٹے وجود کو باور کرانا چاہتی تھی کہ وہ اس کی اداکاری سے واقف ہے۔ لیکن اس کو شش کا اس پتھر وجود کے اوپر کوئی اثر ہوتا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ جب بے چینی حد سے سوا ہو گئی تو اس نے ایک بار پھر فیصلہ کن انداز میں اس کی طرف کروٹ بدلی۔ اور بے حد دیر سے اپنا ہاتھ رخ پھیر کر لیٹے ہوئے حدید کے بازو پر رکھا۔

ایک قطعہ ایک لمحہ یا اس سے بھی کم وقت لگا تھا۔ اور حدید نے اپنا بازو یوں جھٹکا جیسے اس پر کوئی زہریلا پتنگا آن بیٹھا ہو۔
 نائلہ اپنی جگہ پر سن سی ہو گئی۔

حدید نے صرف ہاتھ نہیں جھٹکا تھا۔ وہ فوراً ”اٹھ کر بیٹھا تھا۔ اور اب انتہائی شعلہ بار نظروں سے اسے گھور رہا تھا۔ اس قدر نفرت، اتنا غصہ اور ایسی چنگاریاں ان آنکھوں سے پھوٹ رہی تھیں کہ نائلہ کو لگا اس کا وجود وہیں پڑے پڑے چند لمحوں میں خاکستر ہو جائے گا۔ اس میں حرکت کرنے کی سکت نہیں رہی تھی۔ نہ اتنی ہمت تھی کہ اپنی نظریں اٹھا کر وہ چہرہ ہی دیکھ لے۔

اس نے نظریں جھکائے اپنے ڈوبتے دل کو سہارا دے کر ایک بار پھر دایاں ہاتھ اٹھا کر حدید کا ہاتھ تھامنے کی کوشش کی۔ اب کی بار اس نے پہلے سے زیادہ زور سے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔
 ”تمہاری ہمت کیسے ہوئی مجھے ہاتھ لگانے کی۔“

وہ دلی آواز میں غرایا۔

نائلہ کو اپنی ہتھیلیوں سے پسینہ پھوٹنا محسوس ہوا۔

اس کے پاس حدید کے سوال کا جواب نہیں تھا۔ اور اگر ہوتا بھی تو شاید جواب دینے کی ہمت نہ ہوتی۔

”بولو۔ کس کی۔ کس کی اجازت سے مجھے چھو اتم نے۔“

وہ اس کے نزدیک جھک کر اس کے چہرے پر اپنا گرم تنفس پھینکتے ہوئے پھنکارا۔ نائلہ بے ساختہ پیچھے ہٹی۔
 ”مجھے۔“ اس کے حلق سے بیٹھی ہوئی سی آواز نکلی۔ اس نے محسوس کیا گلے میں کانٹے سے چبھنے لگے۔ آن واحد میں پانی کی طلب جاگ اٹھی تھی۔

”مجھے اجازت کی۔“ بات مکمل ہونے تک صرف الفاظ باقی رہ گئے۔ ”کیا ضرورت۔“ آخری الفاظ صرف لبوں کی جنبش سے ظاہر ہوئے۔

وہ زور سے پیروں پر ڈالی ہوئی چادر اتار کر پٹختے ہوئے اٹھا۔ اور کمرے سے باہر جانے لگا۔ نائلہ کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ اس کی کوئی بات تک سننے کا روادار نہیں ہو گا۔ وہ خود سے فرض کیے بیٹھی تھی کہ ہمیشہ کی طرح جب وہ اس کو اپنی ذرا سی توجہ سے نوازے گی تو وہ سب کچھ بھول بھال کر پھر سے پہلے جیسا ہو جائے گا۔ لیکن اس بار ایسا نہیں ہوا۔

اسے یوں کمرے سے جاتا دیکھ کر اس کے نیم مردہ تن میں جانے کہاں سے کون سی زندگی جاگی کہ وہ خود بھی ایک دم سے بیڈ سے اتر کر اس کے پیچھے لپکی۔ اور بند دروازے سے دو قدم پہلے اس کا بازو تھام کر اسے روک لیا۔

”چاہے آپ مجھ سے جتنے بھی خفا ہو جائیں۔ لیکن کمرے سے باہر مت جائیں۔ خدا کے لیے ایک بار صرف ایک بار میری بات سن لیں۔“

حدید نے ایک بار پھر اپنا بازو جھٹک دیا۔

”ہمارے درمیان کہنے سننے جیسا کوئی رشتہ نہیں۔ بہتر ہو گا تم یہ خیال ہی دل سے نکال دو کہ اب میں تمہاری کوئی بات سنوں گا۔“

اس کی آواز دھیمی لیکن بے حد ہموار تھی۔ اور شاید اتنی بے رحم بھی۔

”نہیں حدید! آپ ایسا نہیں کر سکتے۔ پلیز پلیز۔ خدا کے لیے صرف ایک بار میری بات سن لیں۔ مجھے اپنے رویے کی بد صورتی کا احساس ہو گیا ہے۔ میں۔“

وہ یکایک ہی دروازے اور اس کے درمیان حائل ہوئی تھی۔ حدید کو اس سے اتنی ہمت کی امید نہیں تھی یا شاید اتنی جلدی جھک جانے کی امید نہیں تھی۔ مگر بہر حال اس کے اندر اٹھتے اشتعال کے بلوے یوں ذرا سی اشکوں کی بوند باندی سے بیٹھنے والے نہیں تھے۔ یہ آندھی شاید ہر چیز کو خود میں سمو کر ہوا برد کرنے والی تھی۔ امید، آرزو، خواب اور شاید۔ یہ رشتہ بھی۔

تک نہیں پہنچا تھا۔ وہ اس کی آنکھوں سے پڑھ لیا اس نے تب ہی سر جھکا کر بولی۔

”یہ مت پوچھنا کہ میں خوش ہوں یا نہیں۔“

ماہا کو اس کی ان کہی بات میں حقیقت بولتی محسوس ہو رہی تھی۔

”مگر تم خوش نہیں ہو تو پھر یہ سب کھڑا کیوں۔“

اس کی آواز سرگوشی سے ذرا ہی بلند تھی۔ عفت نے جواب نہیں دیا۔ وہ بڑے انہماک سے اپنے ناخنوں پر لہسن کا جوار گڑ رہی تھی۔ نیل پالش لگانے کی عیاشی کی عادت ہی نہیں تھی۔ ماہا کو جواب کا انتظار تھا بھی نہیں۔ وہ خاموشی سے عفت کے سر جھکائے ہوئے وجود کو سرنا پیر دیکھتی رہی۔

وہ ایک مکمل لڑکی تھی۔ لیکن بھرپور نہیں۔ اس کی تازگی اور جاذبیت یوں لگتا تھا کسی نے چھین لی ہے۔ جیسے زندگی میں رنگ نکال کر صرف سرخ و سیاہ امتزاج پھیرا گیا ہو۔ بھلا۔۔۔ بھلا ایسی ایسی بھی کوئی کی تھی۔ جو ایک اچھی خاصی صورت اور نیک سیرت لڑکی کو یوں پت جھڑاؤڑھا کر چلی گئی تھی۔ اس کے دل میں خیال کا ایک کوندا سا لپکا۔ وہ بری طرح چونک رہی۔

”تو گولی کھا کر آرام کر لے۔“ عفت نے کہا۔ ”تائی اماں کی آواز ابھی بھی آرہی تھی۔“

ماہا نے کسی نام پر عفت کے ہاتھوں کو رکھتے اور پھر لرزرتے دیکھا۔

”تو ایک بار کہہ کر تو دیکھ۔ نہیں کرے گا انکار بہت نیک بچہ ہے۔“

وہ جہاں کی تہاں تھم سی گئی۔ اس کے باہم جڑے ہوئے لب و لہجے عفت کی پلکوں کی لرزش اور کپکپاتے ہونٹوں نے کسی اور اک کا دروازہ کھولا۔ اور اس کے دل سے نکلی اپنے قیاس کے غلط ہونے کی دعا اس کھلے دروازے کے دوسری جانب سے جھانکتی آگئی کی تاریکی میں گم ہو گئی۔

آگئی۔ ہاں آگئی۔

آگئی جو اجالا بھی ہے اور امید بھی۔ یہی آگئی تیر بھی ہے اور تیرگی بھی۔ عذاب بھی ہے اور آشوب بھی۔ رنجیدگی بھی ہے۔ رہائی اور رحمت بھی۔

اسی آگئی کی تاریکی میں اس نے کمرے کی ہر ایک شے کو دھواں بن کر ہوا میں اڑتے دیکھا۔ صرف ایک عفت کا چہرہ تھا جو اس کی ہستیوں میں نقش تھا۔ اور صرف ایک آواز تھی جو باہر سے آرہی تھی۔ ایک نام پر کارر رہی تھی۔ وہ دونوں اس نام کو جانتی تھیں۔ لیکن ماہا کو لگا جیسے اس نے زندگی میں اس سے پہلے نہ یہ چہرہ کبھی ٹھیک سے دیکھا تھا۔ نہ یہ نام ہی سنا تھا۔

”عفت نے کیوں منع کر دیا خیر تو ہے۔“

عفت نے ہاتھ میں پکڑی چیز ڈرینک نیپل پر ڈالی اور آہستگی سے کھڑی ہو کر مڑی۔ وہ شاید ماہا کی ٹٹولتی کھوجتی نگاہوں میں اترتی الہامی کیفیت کو بھانپ گئی تھی۔ اور اس سے پہلے کہ ماہا کوئی سوال کرتی وہ خود کو اور اس کو بھلا لیتا چاہتی تھی۔ لیکن ایسا ہو نہیں سکا۔

ماہا نے بے اختیار اٹھ کر اس کا کندھا تھاما۔ وہ پیچھے سے اس کے سامنے آئی۔ اور عفت بے اختیار سے مڑ کر دوبارہ ڈرینک کے سامنے جا بیٹھی۔ خود کو چھپانے کی بہت بے ساختہ اور معصوم سی کوشش تھی۔ لیکن ناکام بھی۔ ماہا اس کی اس حرکت پر چند لمحے وہیں کھڑی رہی۔ پھر پشت سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ بے حد مدہم سے۔ بہت ہولے سے اس کے لبوں میں جنبش ہوئی۔

”عفت! کیا تم کسی اور کو۔“

آئینے میں دکھائی دیتے عکس نے اپنی نگاہیں جھکا رکھی تھیں۔ اور جب وہ نگاہیں اٹھیں۔ تو ان میں ایک سمندر

ماہنامہ کون 229 جولائی 2015

اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ حدید نے اسے بازوؤں سے پکڑ کر شدت سے برابر میں جھٹک دیا۔ وہ اس بری طرح لڑکھڑائی کہ برابر میں رکھے صوفے کے کونے سے اس کا سر لگتے لگتے بچا۔ وہ لمحے سے بھی کم وقت میں انتہائی جارحانہ انداز میں دروازہ کھول کر باہر نکلا تھا۔ لیکن لاؤنچ میں پڑے صوفے پر چادر تان کر سوتی سوہا کو دیکھ کر ذرا کی ذرا ٹھہرا۔ گہری سانس بھری پھر سیدھا چکن کا رخ کیا۔

نانکھ نے باہر آکر سوتی ہوئی سوہا کو دیکھا۔ پھر ایک نظر غٹا غٹا پانی کا گلاس چڑھاتے حدید کو سوہا کی موجودگی میں وہ بھلا کیا کر سکتی تھی۔ کچھ بھی نہیں۔ کچھ کہنا اس کے آگے اپنا تماشا بنوانے کے مترادف ہو گا۔ انس کی غیر موجودگی میں اس کی فیند کس قدر بچی ہوئی اس کا اندازہ اس کے کسماتے وجود سے لگایا جاسکتا تھا۔

اس نے انتہائی بے بسی کی سی کیفیت میں حدید کو میڈھیال پھلانگ کر چھت پر جاتے دیکھا۔ اور پھر پورے جسم میں سرایت کرتی ایک بے نام سی ٹھنکن کو محسوس کیا۔ واپس کمرے میں قدم رکھتے سے اسے یکایک ہی اپنا وجود اور اپنی زندگی سب بالکل بے کار معلوم دے رہا تھا۔

دھڑ سے بیڈ پر بیٹھ کر اس نے دونوں ہاتھوں میں سر گرالیا۔

بست عرصے کے بعد گھر میں ایک بار پھر رونق سی جاگ گئی تھی۔ بلکہ نچلے حصے میں کہا جائے تو غلط نہ ہو گا۔ یہ چہل پہل اور خصوصی صفائیاں تو بس شادی اور ولیمہ کے دنوں میں ہی ہوتی تھیں۔ اس کے بعد تو جیسے خوشیوں اور رونق نے نچلے پورشن سے منہ موڑ کر سیدھا میڈھیال کا رخ کرنا شروع کر دیا تھا۔

نانکھ کی شادی کے وقت بھی اس قدر خاموشی اور سادگی تھی کہ ذرا مزاج نہیں آیا تھا۔ اوپر سے خود نالکھ کی عجیب و غریب کیفیت اور اس سے بھی زیادہ اس کا کاکٹ کھانے والا مزاج ماہا اور سوہا کو اس سے دور ہی رکھتا تھا۔ لیکن آج معاملہ ذرا الگ تھا۔ ماہا نے خود عفت کے ساتھ مل کر پورے دل سے لگ کے پورے گھر کی نہ صرف صفائی کی۔ بلکہ صفائی سے فارغ ہونے کے بعد مہمانوں کی آنے میں جب ذرا وقت تھا تو عفت کو بھی رگڑ ڈالا۔ اس کے نہ نہ کرتے کرتے بھی آوہا پونا فیشنل تو ہو ہی گیا تھا۔ رہی سہی کسر ہلیج کریم نے پوری کر دی۔

حسیب سے ناراضی اور پھر اس کے فون نہ کرنے کی خفگی اپنی جگہ لیکن عفت اس نے ہمیشہ ہر موقع پر ان دونوں بہنوں کا برہہ کر ساتھ دیا تھا۔ جو اپنائیت عفت کے وجود سے پھونتی تھی۔ وہ نالکھ کے آس پاس بھی محسوس نہیں ہوتی تھی۔

”ارے واہ لو! یہ کیا بات ہوئی۔ لڑکی کی بہن ہو تم۔ کیا پتا وہ لوگ ملنا چاہیں اور نہ بھی ملنا چاہیں۔ تو آج ویسے بھی تمہیں ہونا ہی چاہیے۔ پہلی بار تو آرہے ہیں۔ وہ لوگ۔“

وہ ایک بچھی بچھی مسکراہٹ سے آئینے میں اپنی پشت پر کھڑی ماہا کا عکس دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ جب اماں کی آواز کانوں میں بڑی ساہا کارو عمل اس کی توقع کے عین مطابق تھا۔

”کیا۔۔۔ نالکھ! تمہیں رہی۔“ اس نے حیرت سے عفت سے سوال کیا تھا۔ عفت کے ہونٹوں کی مسکراہٹ بجھ کر بالکل ہی معدوم ہو گئی۔

”پتا نہیں۔“ اس کے لہجے میں ایک بے نام سی اداسی تھی۔

ماہا پیچھے سے گھوم کر ڈرینک پر اس کے سامنے آگئی۔

ایک بات پوچھوں عفت! تم سے۔“

عفت جو بے دلی سے اپنی نظریں جھکا کر کھڑی تھی۔ چونک کر سر اٹھا کر اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔ جو سوال ابھی لبوں

ماہنامہ کون 228 جولائی 2015

بھرا تھا۔ سا کادل ڈوب ڈوب گیا۔ وہ دونوں آئینے میں ہی ایک دوسرے کو دیکھتی رہیں۔ پھر عفت کے لب ہلے۔
 ”اب بھلا پوچھنے سے کیا فائدہ۔ اور اب۔ اس نے پلکیں جھکا دیں۔ اور سمندر رہ نہ نکلا۔“
 ”اب بھلا گھٹنے سے بھی کیا فائدہ۔“

”کون ہے وہ۔ کیا۔ کیا حدید بھائی۔“ اس کی سرگوشی نقارے کی چوٹ جیسی لگی۔ عفت تڑپ کر اس کی طرف پلٹی۔
 ”تمہیں قسم ہے ماہ۔ آج کے بعد میرے سامنے کبھی ان کا نام نہیں لینا۔“ ایک گولا سا حلق میں پھنس رہا تھا۔
 بات کرنی محال تھی۔ لیکن اسے کتنا تھا۔ ہر حال میں کتنا ہی تھا۔ ماہ نے اپنی گیلی آنکھیں پوچھنے کے بجائے اس کا چہرہ صاف کیا۔ اس کا دل کیوں اتنی تیزی سے بھر آیا تھا۔ اسے خود بھی پتا نہیں چلا۔
 عفت بے اختیار ہو کر دونوں بازو اس کی کمر پر باندھے اس سے لپٹ گئی۔ شاید خود اپنی ذات کے زنداں میں جیتے جیتے اس کا دم گھٹنے لگا تھا۔ اسے روزن کی تلاش تھی۔



آنے والی خواتین تصور سے بہت ستر تھیں۔ ساتھ سے کپڑے تھمے نہ گھرے میک اپ کی تمہیں تھیں نہ چٹخی لپ اسٹیکس نہ زیور کی بھرمار نہ نمائش نہ جیتے جیتے سوالات۔
 امی اور تانی امی نے ان سے مل کر بے اختیار ہی سکون کا سانس بھرا تھا۔
 ”اللہ کا دیا سب کچھ ہے ہمارے گھر میں۔ ہک۔ ہاں۔ کمی ہے تو بس اک گھروالی کی۔“ انہوں نے ایک گہری ٹھنڈی سانس بھری۔ پھر سلسلہ کلام جوڑا۔
 ”ماشاء اللہ سے میری مرحوم بہو بہت شاندار چیز لے کر آئی تھی۔ گھر بھر دیا تھا۔ حالانکہ ہم نے تو اس کے گھر والوں کو بھی منع کیا تھا۔ لیکن۔“

”خیر اب ان سب باتوں کا کیا فائدہ۔ امی تو بس جذباتی ہو گئیں۔ آپ بلا میں نا! اپنی بیٹی کو۔ کیا نام ہے بھلا۔“ یہ لڑکے کی بڑی ہنس تھی۔ بروقت اپنی ماں کو ٹوک کر سنبھالا دیا۔
 جی عفت نام ہے میری تانی زاد بہن ہے۔“ ماہ نے جلدی سے مسکرا کر بات بڑھائی۔
 ”ہاں بہن جانے والے چلے جاتے ہیں۔ رہ جانے والے تو بس یاد ہی کرتے رہ جاتے ہیں۔“ لڑکے کی ماں ابھی بھی اپنے جذباتی فیر سے باہر نہیں نکلی تھیں۔
 ”ماشاء اللہ سے ایسے طریقے سے پورے گھر کو سنبھالا تھا اس نے دیکھنے والے مثالیں دیتے تھے اپنی بہو بیٹیوں کو اس کی۔ مجھے تو بس پٹنگ پر ہی بٹھا دیا تھا۔“

ان کا بیان مزید جاری رہتا تھا۔ امی اور تانی امی کو اب ایک بے نام سی الجھن سی محسوس ہونے لگی تھی۔
 ”آئی میں عفت کو بلالاتی ہوں۔“ ماہ نے ہی انہیں درمیان میں ٹوک کر احساس دلایا کہ وہ یہاں اپنی بہو کا قصیدہ پڑھنے نہیں بلکہ نئی سوپنڈ کرنے آئی ہیں۔
 ”اور آئی ان شاء اللہ آپ عفت کو دیکھ کر بھی مایوس نہیں ہوں گی۔“
 کمرے سے نکلتے نکلتے اس نے اپنے حصے کی کارکردگی دکھانا ضروری سمجھا۔ اس کے نکلنے کے بعد اس کا انٹرویو بذریعہ امی شروع ہوا۔

”یہ کون لڑکی ہے۔ اچھا اچھا۔“

”شادی شدہ ہے۔“ یہ لپچایا ہوا سوال بہن کی جانب سے آیا تھا۔

ماہ کا ظاہری حلیہ اپنے شوہر کے اچھے مالی حالات کی چغلی کھاتا تھا۔ اس وقت بھی اس نے ایک قیمتی سوٹ کے ساتھ کانوں میں سونے کے ٹاپس اور ہاتھوں میں نعلی لیکن بے حد نفیس کڑے کا سیٹ پہن رکھا تھا۔ ہلکے میک اپ اور سلیقے سے بنے بالوں میں اس کے انگ انگ سے نوبیا ہتاؤں والا دلہنایا جھلک رہا تھا۔ بچے نہ ہونے کی وجہ سے اس کے متناسب سراپے میں بھی کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی تھی۔ خواتین کی باتوں اور تعقیب سے صاف ظاہر تھا کہ اگر ماہ غیر شادی شدہ ہوتی تو یقیناً ”یہ رشتہ اس کی طرف پلٹ چکا ہوتا۔“

عفت نے کمرے میں آ کر دھیرے سے سلام کیا۔ ماہ اس کے ساتھ اندر نہیں آئی۔ وہ چائے لینے کے لیے وائنٹ باہر رک گئی تھی۔

آنے والی دونوں خواتین نے اسے بہت شوق اور اصرار سے اپنے درمیان میں بٹھایا تھا۔ ان کے عفت کو دیکھ کر کھل اٹھنے والے چہروں سے اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ انہیں عفت پسند آئی تھی۔

چند ایک رسمی سوالات اور چائے کی کرجب وہ رخصت ہوئیں تو نہ صرف انہیں اپنے گھر آنے کی دعوت دے گئی تھیں۔ بلکہ خود بھی جلد ہی دوبارہ آنے کا عندیہ بھی ظاہر کر گئی تھیں۔

تانی امی نے ان کے جاتے ہی دو رکعت نماز نفل کی نیت باندھ لی۔ عفت نے برتن سمیٹ کر دھونے کے لیے باورچی خانے کی راہ لی۔ اور امی نے اوپر کی۔ البتہ جانے سے پہلے تانی ابو کو تفصیلات سے آگاہ کرتی گئیں۔ تانی ابو کا چہرہ بھی خوش اور خوشی سے تمٹھا اٹھا تھا۔



”کوئے میں چلا گیا وہ۔“

یاور انہیں تمام کرنزدیکی بیچ تک لایا۔ اور وہ اس پر ڈھسے گئے۔ خود یاور بھی لمحہ بھر کے لیے چپ سا رہ گیا۔
 ”اوہ میرے خدا یا!۔“ مغیث حسن کا انداز بے حد مجرمانہ سا تھا۔
 ”سر پلیر آپ خود سنبھالیں۔ آپ کی طبیعت نہ بگڑ جائے کہیں۔“
 ”نہیں میں ٹھیک ہوں۔“

چند لمحے گزرے۔ یاور تشویش سے انہیں دیکھتا رہا۔ اس کے نیچر اور باس مغیث حسن کی پریشانی اس کے لیے نئی نہیں تھی۔ وہ کسی بھی شخص کے جانی یا مالی نقصان پر اسی طرح پریشان اور افسردہ ہو جاتے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے ان کو بے حد سخی اور فیاض دل سے نوازا تھا۔ اور جس قدر خلوص دل سے وہ خلق خدا کے کام آتے تھے۔ اسی قدر فیاضی سے انہیں رب تعالیٰ موقع بھی فراہم کر رہا تھا اور سہولت بھی۔

ان کے تقریباً ہر اسکول میں ایسے غریب لیکن ذہین طلبا زیر تعلیم تھے۔ جن کے والدین محدود آمدنی اور وسائل کی وجہ سے انہیں تعلیم دلانے سے قاصر تھے۔

بظاہر ان کی زندگی مکمل تھی۔ عزت، دولت اور شہرت۔ ہر وہ چیز بن مانگے ان کو مل گئی تھی۔ جس کی کوئی بھی شخص تمنا کر سکتا ہے۔ گھر تھا۔ محبت کرنے والی شریک حیات تھیں۔ نہیں تھی تو بس ایک اولاد نہیں تھی۔

سالہا سال انتظار اور ڈھیروں کوششوں کے بعد اب انہوں نے خود کو جو اللہ کی مرضی کہہ کر سمجھا بجالایا تھا۔ لیکن ایک دعا تھی۔ جس کا دامن آج بھی وہ اور ان کی بیگم تھامے بیٹھے تھے۔

”سر! آپ ٹھیک ہیں سر۔“

”ہاں ہاں میں ٹھیک ہوں۔“

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بُک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرٹک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بُک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بُک کا پرنٹ پریویو
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

